اسلام آباد میں ماہانہ سلسلہ وار درسِ قرآن

شانِ اولیت سورۃ فاتحہ

از افاداتِ عالیہ

نابغہ عصر جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری
بانی و سرپرستِ اعلیٰ ادارہ منہاج القرآن

ادارہ منہاج القرآن اسلام آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ حال

یہ ایک فطری امر ہے کہ انسان جس چیز سے محبت کرتا ہے اس کا ذکر اکثر اس کے قول وفعل سے نمایاں رہتا ہے۔ اگر کوئی محبوب کے قول وعمل پر سر تسلیم خم نہیں کرتا اور اس کی پسند کو اپنی پسند قرار نہیں دیتا تو وہ محبت کے دعوے میں جھوٹا ہے۔ یا وہ محبت کا معنی سمجھنے سے قاصر رہا ہے۔ ہم اپنے کو مسلمان کہنے والے دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ ہمیں اسلام سے اور بانیٔ اسلام سے محبت ہے۔ یہ صرف ہماری پسند ہی نہیں بلکہ بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے خالقِ کائنات نے خود حکم دیا ہے کہ ہمیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اپنی جان، مال، آبرو اور ہر چیز سے بڑھ کر محبت ہو تب جاکر ہم اللہ جل شانہٗ کے محبوب ٹھہریں گے اور اسلام اور بانیٔ اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے والہانہ محبت و اطاعت کے جذبہ کو قائم رکھنے کے لئے اسلام کے اساسی قانون یعنی قرآنِ مجید کو پڑھنا اور سمجھنا ہوگا۔ تب جاکر ہم کہیں زندگی کے ہر شعبے میں ان اصولوں کو اپنے اوپر نافذ کرسکیں گے۔ اور پھر ان اصولوں کو پڑھ اور سمجھ کر ایمان اور یقین کی دولت سے مالا مال ہوسکیں گے کیونکہ ایمان اس وقت مکمل ہوتا ہے جب وہ یقین کی حد تک پہنچ جائے اور یقین کا معنی بڑی آسانی سے اس مثال سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ انسان آگ کے دہکتے ہوئے انگارے پر ہاتھ اس لئے نہیں رکھتا کہ اسے یقین ہے کہ وہ جلا دے گی۔ اور سانپ کے منہ میں ہاتھ یا وجود کا کوئی حصہ اس لئے نہیں لگاتا کہ وہ ڈس لے گا اور اس کا زہر اس کی موت کا سبب بن جائے گا۔

کیونکہ انسان کو ان دونوں چیزوں کے اثرات کا علم ہے اور وہ یقین کی حد تک ہے۔ اگر ہمیں قرآن اور معارف قرآن کا یقین ہو جائے تو ہم زندگی کے ہر ہر شعبے میں اسی نظام کو اپنے اوپر نافذ کرنا اپنی ابدی سعادت سمجھیں گے۔

اللہ جل مجدہٗ نے اپنے فضل و احسان سے ادارہ منہاج القرآن کو یہ توفیق مرحمت فرمائی ہے کہ جس کی کوشش سے پاکستان کے پانچ مراکز لاہور، کراچی، کوئٹہ، پشاور، اسلام آباد میں ماہانہ تسلسل سے بانی و سرپرستِ اعلیٰ ادارہ منہاج القرآن جناب مفکرِ اسلام مفسرِ قرآن پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری مدظلہ العالی درسِ قرآن کی مجالس سے خطاب کرتے ہیں۔ اسلام آباد میں رحمت علی کمیونٹی سنٹر میں ہر ماہ کے دوسرے اتوار کو بعد نماز مغرب یہ درسِ قرآن ہوتا ہے اور اس میں بعض اوقات دنوں کی تبدیلی بھی کی جاتی ہے۔

ادارہ منہاج القرآن، اسلام آباد نے عوام کی سہولت کے لئے ان دروس کو آڈیو، وڈیو کی شکل میں محفوظ کر لیا ہے۔ جو ادارہ کے ضلعی دفتر سے دستیاب ہیں اور لائبریری سے بھی استفادہ کے لئے مل سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان دروس کو کیسٹس سے کتابی شکل میں بھی لانے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ یہ ادارہ کی طرف سے درسِ قرآن کا دوسرا کتابچہ ہے۔ پہلا درس اسمائے سورۃ فاتحہ پر تھا۔ اب یہ دوسرا درسِ قرآن سورۃ فاتحہ کی شانِ اولیت پر ہے۔ ہم نے اس درس کو کتابی شکل میں لانے کے لئے کسی تبدیلی کو جائز نہیں سمجھا اس لئے من و عن نقل کر دیا گیا ہے۔ ہم کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔ ہمارے قارئینِ محترم اس پر اپنی آراء سے نوازیں گے۔ اور ہم انشاء اللہ ان دروس کو آئندہ بھی شائع کرنے کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ ہر نئے درس کے موقع پر گذشتہ درس کا کتابچہ انشاء اللہ بک سٹال پر موجود ہوگا۔

ہم خداوندِ کریم و رحیم سے ملتجی ہیں کہ وہ ہمیں اس قرآن پاک کی خدمت کرنے کی مزید توفیق دے اور اس مشن پر ثابت قدم فرمائے اور ادارہ منہاج القرآن کی تمام کوششوں کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ آمین بحق النبی صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وازواجہ اجمعین۔

طالبِ دعا

قاری ناصر محمود احمد سیالوی

ناظم نشر و اشاعت ادارہ منہاج القرآن، ۲۷-بی، فرخ پلازہ جی نائن مرکز (کراچی کمپنی)، اسلام آباد۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

نحمدہ و نصلی و نسلم علیٰ سیدنا و مولٰنا محمد نبی الامین المتین الکریم الرؤف الرحیم ۝

اما بعد۔ فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۝ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝ الحمد للہ رب العٰلمین ۝ صدق اللہ مولٰنا العظیم ۝

محترم مشائخ و علمائے کرام و معزز خواتین و حضرات! اللہ رب العزت کا فضل اور احسان ہے کہ ہم آج بھی حسبِ سابق محض اس کی توفیق سے اس کی رضا کے لئے اس کی مقدس کتاب کے درس کی مجلس میں حاضر ہیں اور میں ہمیشہ اللہ جلّ مجدہٗ کی بارگاہ میں بڑی عاجزی سے شکر ادا کرتا ہوں اور آپ کی خدمت میں بھی اس شکر کی بجا آوری کی درخواست کرتا ہوں کہ جہاں اس کے ادارہ منہاج القرآن کے مشن پر اور اس خالص دینی اخلاص پر مبنی تحریک پر بے پناہ انعامات اور احسانات ہیں۔ ان میں سے ایک یہ احسان ہے کہ اس نے اپنے قرآنِ مجید کی خدمت کی توفیق عطا کی ہے اور وہ توفیق اس شکل میں بحمد اللہ تعالیٰ اس وقت اِدارہ منہاج القرآن پاکستان میں وہ واحد ادارہ ہے جو اللہ کی توفیق اور اس کے احسان سے پاکستان کے پانچوں مراکز پر یعنی وفاقی مرکز اور چاروں صوبوں کے مرکز، کراچی، کوئٹہ، پشاور اور لاہور اور اسلام آباد پانچوں مراکز پر اب سالوں سے تسلسل کے ساتھ بغیر انقطاع کے ایک مربوط اور مسلسل نظام کے مطابق درسِ قرآن کی بڑی بڑی نشستیں منعقد کر رہا ہے۔ اللہ پاک کا یہ منفرد احسان ہے۔ بہت احباب اللہ کی توفیق سے قرآن مجید کے درس، تبلیغ اور خدمتِ قرآن کا کام انجام دے رہے ہیں۔ اللہ پاک سب کی کوشش کو قبول فرمائے اور پوری اُمت میں اس درد کو اور زیادہ بیدار فرما دے۔ اور قرآنِ مجید کے معالم اور معارف اور شعور کو سینے سینے میں روشن کر دے۔ اور جہاں بھی کوئی خدمت دین اور خدمتِ قرآن و سُنت کا کام انجام دے رہا ہو اُسے اپنی بارگاہ میں شرفِ قبول عطا فرمائے۔

لیکن یہ درجہ شکر ہے۔ یہ مقام شکر ہے کہ منہاج القرآن کو اس نے یہ توفیق بطورِ خاص عطا کی ہے کہ وہ مسلسل ایک نظام کے تحت باقاعدگی کے ساتھ ملک کے پانچوں مراکز پر ماہانہ سلسلہ وار دروس کی نشستیں منعقد کر رہا ہے۔ اور آپ حضرات کو کبھی کراچی جانے کا اتفاق ہو تو اللہ کا شکر ہے کہ کراچی کے ماہانہ درسِ قرآن میں کم و بیش دس ہزار افراد شریک ہوتے ہیں۔ ماہانہ درسِ قرآن میں کم و بیش آٹھ سے دس ہزار یا اس سے بھی کم و بیش کچھ زیادہ۔ اتنے افراد شریک ہوتے ہیں۔ اور وہ اندرونِ سندھ دو سو تین تین سو میل

تک سے آتے ہیں۔ پورا صوبائی مرکز وہاں پنج ہوتا ہے اور کوئٹہ میں بحمداللہ تعالیٰ لوگوں کا رجحان درسِ قرآن کی اس مجلس میں شرکت کا بہت روز افزوں ہے اور وہ بھی کوئٹہ کے پورے صوبے سے دور دراز اندرونِ بلوچستان کے علاقوں تک سے لوگ آ رہے ہیں۔ یہ کیفیت بحمداللہ تعالیٰ پشاور میں ہے:

پشاور میں سوات اور چترال اور ڈیرہ اسماعیل خان تک کے لوگ ماہانہ درسِ قرآن میں آتے ہیں۔ یہ نظام صرف اور صرف اللہ کی رحمت اور اس کے فضل سے قائم ہے۔ ورنہ ہم نہ اس قابل تھے نہ اس قابل ہیں کہ اس نظام کو باقاعدگی کے ساتھ چلا سکیں۔ بس آپ کی خدمت میں یہ درخواست اس لئے کی کہ آپ بھی اللہ کی بارگاہ میں شکر بجا لاتے رہا کریں۔ چونکہ ہم ناکارہ لوگ ہیں اس لائق بھی نہیں کہ اس کے دین کی اس کے قرآن کی خدمت کر سکیں۔ لیکن اس کا کتنا احسان ہے کہ ہماری نااہلیتوں اور ناکاریوں کے باوجود ان سے صرفِ نظر کر کے اس نے اپنے دین کی نوکری اور چاکری عطا کر رکھی ہے۔ [1] "لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ" تو اگر تم شکر کرو تو میں اپنی نعمت اور بڑھا دوں۔ یعنی آپ جب مکان بناتے ہیں، چھوٹی فیکٹری اور دفتر کھولتے ہیں تو آپ بھی اس میں نوکری کے لئے آدمی کو چھان بین کر کے اچھے آدمی کو رکھتے ہیں جو اس کام کا اہل ہو اور جو اہل نہ ہو، ناکارہ ہو، نالائق ہو۔ آپ چھوٹے سے کھوکھے پر بھی اس کو ملازمت دینے پر، نوکری دینے پر تیار نہیں ہوتے کہ نقصان نہ پہنچائے یعنی یہ ہمارا ظرف ہے کہ ہم کسی معمولی سے کام کے لئے نالائق کو پسند نہیں کرتے اور کیا عالم ہے الوہیت کے ظرف کا۔ اس مالک کے ظرف کا عالم کیا ہے کہ ہم سے بڑھ کر بھی کوئی نالائق اور ناکارہ اور نااہل ہو گا۔ باوجود ہماری نالائقیوں کے اس نے اپنے دین کی نوکری عطا کر رکھی ہے۔ یہ اس کا بڑا احسان ہے اور اس کا بڑا انعام ہے سو اس میں آنا، شرکت کرنا اس مشن سے وابستہ ہونا اور اس خدمت دین کے اور احیائے اسلام کے اور اتحادِ امت کے کام کو آگے بڑھاتے رہنا یہ سب کچھ فقط اس کے احسان اور اس کے انعام سے ہوتا ہے اور اگر آپ اسی انعام میں اضافہ چاہتے ہیں تو اس کی ایک صورت میں نے عرض کر دی کہ بڑھ کر ہر وقت اس کا شکر بجا لایا کریں۔ شکر جتنا زیادہ بجا لائیں گے۔ انعام اتنا زیادہ ہو گا۔ اور باقی رہ گئیں یہ باتیں، مختلف قسم کی مخالفتیں اور مختلف قسم کی تہمتیں اور الزامات یہ ایک قدرتی پروسیس (Process) ہے اور ایک تاریخ کا حصہ ہے یہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے اس پر نہ گھبرانا چاہیئے۔ نہ دل تنگ کرنا چاہیے اور نہ ایسا کرنے والوں سے الجھنا چاہیئے۔ ان سب چیزوں کا سب سے بہتر جواب صبر اور شکر ہوتا ہے۔ اور صبر اور شکر کی خاموشی میں ہے اس لئے کہ گاڑی جب چلتی ہے اور جتنی تیز چلنے لگتی ہے اس قدر گرد و غبار بھی اٹھتا ہے اور روڑے بھی اور

[1] سورۃ ابراہیم پ ۱۳ آیت ۷

کنکریاں کبھی اڑ اڑ کر ڈبوں کو لگتے ہیں لیکن لگ لگ کر گرتے رہتے ہیں اور گاڑی آگے چلتی رہتی ہے اور اگر ڈرائیور اور گاڑی یہ سوچنا شروع کر دیں کہ گرد و غبار اڑ رہا ہے اور کنکریاں لگ رہی ہیں اور روڑے اڑ رہے ہیں تو میں رک جاؤں۔ تو پھر سفر رہ جاتا ہے۔ تو روڑوں کا اپنا کام ہے کہ وہ اڑ اڑ کر لگتے جائیں گے اور گرتے جائیں گے اور گاڑی کا ایک اپنا حال کہ وہ مسلسل سفر کرتی جائے گی۔

اللہ کا کرم ہے۔ اس کا احسان ہے اور یہ باتیں وہیں ہوتی ہیں جہاں اللہ کی کچھ نعمت ہوتی ہے تو جہاں کچھ نہ ہو وہاں کوئی بات نہیں کی جاتی۔ سو میں پھر درخواست کرنا چاہتا ہوں وہ لوگ جو منہاج القرآن سے وابستہ ہیں، رفقاء وارکین اور وابستگان اور جو محبین ہیں اس مشن کے اور یہاں جو حاضرین ہیں اور دور سے محبت کے ساتھ چل کر آئے ہیں۔ وہ ان باتوں کو سنا کریں اور اللہ کی بارگاہ کے سپرد کر دیا کریں۔ نہ دل کو کبھی تنگ کریں اور نہ کبھی کسی کو جواباً بُرا بھلا کہیں اور اگر آپ جواباً بُرا بھلا کہیں گے تو وہ جو اللہ کی نعمت اُتر رہی ہے وہ رک جائے گی۔ اس لئے اگر کوئی کسی کو گالی دیتا ہے تو یہ بھی احسان کرتا ہے اس پر۔ اگر آپ گالی کے حق دار نہ ہوں اور کوئی آپ کو گالی دے تو مفت میں آپ کے گناہ بخشے جائیں گے۔ آپ پر اللہ کی رحمتیں ہوں گی۔ آپ کے درجے بلند ہوں گے۔ اس گالی دینے والے بھائی نے کتنا بڑا احسان کیا آپ پر۔ کہ آپ نے عمل نہ کیا اور مفت میں درجے بلند ہوگئے اور رحمتیں ملیں اور نعمتیں ملیں۔ اور گناہ معاف ہوئے اور یہ اللہ رب العزت کا ایک نظام ہے جو ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے اور چلتا رہے گا۔

حاضرین محترم! ہماری آج کی مجلسِ درسِ قرآن کا موضوع بحمد للہ تعالیٰ ایک بڑا اہم موضوع ہے اور وہ اہم ہے علمی اعتبار سے۔ آپ کو معلوم ہے کہ موضوعات میں تنوع ہوتا ہے۔ کبھی ایسا موضوع آتا ہے جب مسلسل درسِ قرآن ہو تو اس کی امپارٹنس (IMPORTANCE) اور اس کی اہمیت علمی اعتبار سے زیادہ ہوتی ہے۔ کبھی اصلاحی اعتبار سے زیادہ ہوتی ہے۔ کبھی اعتقادی اعتبار سے زیادہ ہوتی ہے کبھی فکری اور نظریاتی اعتبار سے زیادہ ہوتی ہے۔ کبھی علمی اور تحقیقی اعتبار سے زیادہ ہوتی ہے یعنی ان موضوعات میں جو تنوع آتا ہے ان پر انحصار ہوتا ہے۔ آج کا موضوع اس کی علمی ایک اہمیت ہے اور اس سے ایک خاص اسلام کے اوپر کئے جانے والے اعتراضات اور الزام کا آپ کو ایک ایسا جواب ان شاء اللہ میسر آ جائے گا بلکہ اس کے لئے ایک ایسا شعور

[illegible] اسلام [illegible] مخالفت رکھنے والے لوگوں کی طرف سے ہونے والے طرح طرح کے اعتراضات کا ایک شافی جواب مل جائے گا یعنی میں ایک تصور کو ان شاء اللہ ایسا واضح کر دوں گا کہ جو بہت سے اعتراضات جو اسلام اور حدیث کو جو خاص طور پر نہ ماننے کے لئے کئے جاتے ہیں۔ ان کی حقیقت آپ کے سامنے کھل جائے گی۔ تو موضوع کیا ہے؟ موضوع ہے "سورۃ فاتحہ کا نزول"۔

مسئلہ یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ کب نازل ہوئی؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ قرآن مجید کی سورتوں میں وہ سورۃ ہے جو سب سے پہلے نازل ہوئی۔ قرآن مجید کی سورتوں میں سب سے پہلے پوری کی پوری سورۃ مکمل سورۃ کے طور پر جس کا نزول ہوا وہ پہلی سورۃ، سورۃ فاتحہ ہے۔

یہ مسئلہ ہے نزول سورۃ کا اور اس ضمن میں اوّلیت تنزیل کی گفتگو ہوگی۔ اوّلیت تنزیل کہ پہلے نزول کے باب میں کچھ علماء کے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اقوال میں اُن کے مابین تطبیق کیا ہے؟ ان کے درمیان مطابقت کی راہیں کیا ہیں؟ اس سے پہلے یہ بات سماعت فرمالیں کہ قرآن مجید کی ترتیب دو طرح کی ہے کتنی طرح کی؟ دو طرح کی۔ ایک کو ہم کہتے ہیں ترتیب نزولی۔ ایک کو ترتیب کتابی یا ترتیب تدوینی۔

ترتیب نزولی ہے وہ ترتیب قرآنی آیات کی کہ جس کے مطابق قرآن مجید کی سورتیں اور آیتیں نازل ہوئیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر۔ اور دوسری ترتیب۔ وہ ترتیب کتابی ہے کہ جس ترتیب کے مطابق قرآن مجید کی سورتیں اور آیتیں قرآن مجید کے اندر موجود ہیں کتابی شکل میں۔ اب یہ بات سمجھ لیں قرآن مجید کے طالب علم ہونے کی حیثیت سے کہ ان دونوں ترتیبوں میں فرق ہے۔ یعنی جو سورۃ نزول میں سب سے پہلے آئی ضروری نہیں کہ کتابی ترتیب میں بھی وہ سب سے پہلے ہو۔ یا جو آیت سب سے آخر اُتری۔ اس کا معنیٰ یہ نہیں کہ قرآن مجید کے اندر کتابی ترتیب میں بھی سب سے آخری ہو۔ اب آپ دیکھتے ہیں کہ سب سے پہلے سورۃ فاتحہ ہے۔ قرآن کی کتابی ترتیب میں اور آخری سورۃ والناس ہے۔ لیکن نزول میں آپ پڑھتے ہیں کہ پہلے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ[1] اُتری اور آخر میں باختلاف روایات کچھ اور آیتوں کا ذکر آتا ہے۔ لیکن "سورۃ والناس" آخری اُترنے والی آیتیں نہیں رکھتی۔ سو اتنی بات آپ سمجھ گئے کہ ترتیب کتابی اور ترتیب نزولی میں فرق ہے۔ یہ فرق کیوں ہے؟ اب اس کو بھی سمجھ لیجئے۔ فرق اس لئے ہے کہ نزول کی ترتیب وہ مقتضائے حالات کے مطابق تھی۔ نزول کی ترتیب اس وقت کے حالات کے تقاضے کے مطابق تھی۔

[1] سورۃ العلق پ ۳۰، آیت ۱۔

نزول کی ترتیب اُس وقت کے حالات کے تقاضے کے مطابق تھی۔ یعنی ایک معاشرہ تھا۔ اس میں

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام موجود تھے۔ اور لوگوں کو قرآنِ مجید اور وحی کی ہدایت کی ضرورت تھی۔ سو جو ضرورت پیش آتی جو مسئلہ اُبھرتا جو situation develope ہوتی اسی کے مطابق قرآن مجید کی آیتیں اتر آتیں۔ عام طور پر تین آیتیں سے لے کر دس دس آیتوں تک کا حصہ بیک وقت نازل ہوتا۔ جو مسئلہ درپیش ہوتا اس کے حل کے لئے آیتیں اترتیں۔ تو نزول تو اس طرح حالات کے تقاضے اور طلب کے مطابق ہوتا رہا۔ یہ تو بڑی سادہ بات ہے۔ آپ سمجھ گئے۔ کتابی ترتیب کیسے وجود میں آئی؟ تو جو آیتیں سورتوں کے حصے جب بھی اترتے۔ اترنے کے ساتھ ہی انہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ بھی وحی کردی جاتی من جانب اللہ جبرائیلؑ امین یہ ہدایت ساتھ لاتے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید میں یہ آیتیں اُتری تو اس وقت ہیں لیکن کتابی ترتیب میں ان کی جگہ یہ ہے۔ اس سورۃ کی جگہ یہ ہے تو کتابی ترتیب بھی مُنَزَّلٌ مِنَ اللہ ہے۔ اللہ کی ہدایت کے مطابق ہے۔ اور نزولی ترتیب بھی اللہ کی ہدایت کے مطابق ہے تو نزولی ترتیب کا مقصد اس وقت کی ضرورتوں کو پورا کرنا تھا اور کتابی ترتیب کا مقصد اور اس پورے نظم میں سورتوں اور آیتوں کو پرو کر کے، بیان کر کے قیامت تک کی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے۔

یہ نزولی اور کتابی ترتیبوں میں فرق ہوا اور دونوں ترکیبیں حق ہیں اور من جانب اللہ ہیں نہ ان میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اجتہاد کا دخل ہے (ذاتی) اور نہ سیدنا عثمانِ غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا کسی صحابیؓ کا۔ یہ دونوں کام اللہ کی طرف سے ہوئے اور یہ کہ چالیس سے بھی زیادہ صحابہ کرامؓ حافظ قرآن تھے۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی حافظ قرآن تھیں اور حافظِ قرآن ہونے کے لئے کتابی ترتیب کے ساتھ ہی حفظ کرنا ضروری تھا نا! اور اسی ترتیب کے ساتھ قرآن حفظ بھی تھا صحابہؓ کو۔ اور آخری دو سالوں میں جبرائیل امین حضورؐ کی بارگاہ میں آئے۔ رمضان المبارک کے مہینے میں اور ساتھ بیٹھ کر ترتیب سے پورے قرآن کا دورہ کیا۔ حضور علیہ السلام پڑھتے تو وہ سُنتے اور وہ پڑھتے تو حضورؐ سنتے۔ گویا کتابی ترتیب بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں مکمل کتابی شکل میں بیان کردی گئی۔ یہ تو دونوں ترتیبوں کا فرق ہوگیا۔ لیکن یہ کتنا بڑا شرف سورۃ فاتحہ کو نصیب ہوا کہ یہ سورۃ پوری کی پوری سورۃ کے حوالے سے نزول میں بھی پہلی ہے اور کتاب میں بھی پہلی ہے۔ یہ شرف کسی اور کو میسر کم ہی آیا ہوگا کہ نزول اور کتاب دونوں میں ترتیب میں اُسے اوّلیت

یہ بات [illegible] سبب [illegible] کے

امتیازات میں سے ہے۔ اور سب سے پہلے وہ چند قول ہیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں اس موضوع پر کہ سب سے پہلے کیا نازل ہوا؟ اس مسئلے پر چند قول سنیئے! پھر آگے یہ عرض کروں گا کہ ان اقوال کو جو کہ باریک Technical مباحث ہیں آپ کے سامنے بیان کرنے کی ضرورت میں نے کیوں محسوس کی؟ ایک سوال ذہن میں ابھرے گا ان اقوال کو پڑھ کر کہ یہ اہلِ علم کی باتیں ہیں مفسرین اس کو ڈیل (Deal) کریں، علماء Deal کریں، اہلِ علم Deal کریں، اہلِ تحقیق Deal کریں۔ اس درس کی مجلس میں اس پر گفتگو کی ضرورت اتنی تفصیل سے اور مثالوں سے کیوں پیش آئی؟ یہ سوال ابھرے گا۔ اس کا جواب اس کے بعد آئے گا۔

تو چار اقوال اس مسئلے پر پائے جاتے ہیں کہ قرآنِ مجید میں سب سے پہلے کیا نازل ہوا؟ ایک قول پہلے تو سورۃ فاتحہ کے بارے میں ہی سمجھ لیں کہ خود سورۃ فاتحہ کے نزول کے بارے میں تین قول ہیں۔ کتنے قول؟ تین قول۔ ایک قول جو معتبر ہے اور سب سے زیادہ قوی اور مضبوط۔ وہ یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ مکی سورۃ ہے اور صاف ظاہر ہے کہ جب سب سے پہلے اترنے والی سورۃ ہے تو مکی ہی ہوگی۔ کیونکہ مکی اور مدنی سورتوں میں فرق ہے۔ چونکہ درسِ قرآن کی مجلس ہے تو میں چاہتا ہوں کہ ضروری باتیں جو مبادیات ہیں وہ بھی ساتھ ساتھ بیان ہوتی چلیں۔ آپ یہ تو پڑھتے ہیں نا۔ اہلِ علم جانتے ہیں علماء سے معذرت کے ساتھ کبھی وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ چھوٹا چھوٹا سبق بیان کرنا شروع کر دیا ہے۔ میں تو علماء کو کوئی بھی سبق بیان نہیں کر سکتا۔ علماء آتے ہیں۔ جتنے بھی علماء آپ یہاں تشریف فرما ہیں۔ آپ کے لئے میری سوچ کا زاویہ اور ہوتا ہے۔ باقی بھائیوں کے لئے اور ہوتا ہے۔ باقیوں کے لئے سمجھتا ہوں کہ سبق دے رہا ہوں۔ آپ علماء کے لئے سمجھتا ہوں کہ سبق سُنا رہا ہوں۔ علماء حضرات جو کسی مسجد کے آئمہ ہیں خطباء ہیں اُن کے لئے ہمیشہ یہ سمجھتا ہوں کہ سبق سُنا رہا ہوں۔ تاکہ اگر صحیح ہو تو دعا دے دیں۔ غلط ہو تو اصلاح فرما دیں اور باقیوں کے لئے بے شک سبق ہوتا ہے۔ اور علماء کا یہاں تشریف لانا ہم اپنی مجلس میں باعثِ برکت، سعادت سمجھتے ہیں کہ اُن کا بیٹھنا بھی ہمارے لئے برکت کا باعث ہوتا ہے اور بلکہ ان کی فیوضات سے ممکن ہے جو اچھی باتیں منہ سے نکلتی ہیں۔ ان میں بھی ان کے فیوضات کا دخل ہوتا ہے اور اللہ پاک اس سے برکت عطا کرتا ہے اور علماء حضرات سے درخواست ہے کہ وہ اپنے حلقے کو اور بڑھائیں تاکہ ہم زیادہ سے

[illegible]

مکّی اور مَدنی سُورة کا فرق تو آپ سمجھتے ہیں۔ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ کوئی سورة مکّی ہے کوئی مَدنی۔ مکّی اور مَدنی سورتوں کی جو تفریق ہے اس پر بھی تین اقوال ہیں اہل علم میں تو میں ان میں نہیں جاتا وہ Detail کی بات ہے۔ امام سیوطیؒ نے اور امام ابن برہانؒ اور علامہ حلبیؒ بہت سارے علمأ محققین نے اس پر تفصیل کے ساتھ بحثیں کی ہیں لیکن معروف قول معتبر قول مکّی اور مدنی سورتوں کے فرق کا یہ ہے کہ جو سورتیں ہجرتِ مدینہ سے پہلے اُتریں خواہ جہاں بھی اُتریں۔ خواہ مکّے ہی میں کیوں نہ اتریں ان کو مکّی سورتیں کہتے ہیں۔ کیونکہ مکّہ میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آئے نا۔ فتح مکّہ کے بعد۔ تو وہ سورتیں اور آیتیں جو ہجرتِ مدینہ کے بعد خواہ مکّہ ہی میں کیوں نہ اُتری ہوں۔ اُن کو مدنی کہتے ہیں۔ یہ تقسیم پیرِیڈ وائز (Period wise) ہے یعنی مکّی اور مَدنی جو زمانے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دورِ بعثت کے۔ یہ تقسیم اِن زمانوں کے اعتبار سے ہے۔ جگہوں کے اعتبار سے نہیں ہے۔ ہاں خیال یہ گزرتا ہے کہ مکّہ میں اترنے والی مکّی ہوں گی اور مدینہ میں اترنے والی مدنی ہوں گی اور جو مکّہ اور مَدینہ سے باہر اُتریں اُن کا کیا ہوگا۔ یہ بھی ایک قول کتابوں میں درج ہے۔ لیکن بتانا یہ ہے کہ یہ تقسیم مکانی نہیں ہے۔ یہ تقسیم زمانی ہے۔ جو ہجرت سے پہلے زمانے میں اُتریں۔ وہ مکّی ہیں۔ جو ہجرت کے بعد کے زمانے میں اتریں، وہ مَدنی ہیں۔

سورة فاتحہ کے نزول کے بارے میں ایک قول تو یہ ہے کہ یہ مکّی سورة ہے اور قرآنِ مجید اسی قول کی تائید کرتا ہے۔ " وَلَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ۝[1] اور بے شک ہم نے تمہیں بار بار پڑھی جانے والی سات آیتیں عطا کیں اور قرآنِ عظیم عطا کیا۔ یہ سورة مکّہ معظمہ میں اُتری۔ یہ آیت بھی مکّہ معظمہ میں آئی۔ اور " اَسبع المثانی " یہ سورة فاتحہ کے اسمأ میں آپ سمجھ چکے ہیں۔ بار بار پڑھی جانے والی۔ دھرائی جانے والی سات آیتیں۔ یہ لقب ہے سورة فاتحہ کا۔ اس سے مراد بالاجماع اور بالاتفاق سورة فاتحہ ہے۔ تو گویا مکّہ کے اندر اُترنے والی آیت کے ذریعے بتایا گیا۔ کہ ہم نے آپ کو سورة فاتحہ عطا کر دی۔ جس سے پتہ چلا کہ اس آیت کے اترنے سے بھی پہلے سورة فاتحہ نازل ہو چکی تھی۔ یہ تو ایک قول تھا۔ اب بہت سے آئمہ محدثین تابعین اس کی تائید کرتے ہیں کتابوں میں اور علمأ کا ذکر کرنا۔ حافظ ابن کثیر ہیں۔ امام ابن جریر طبری ہیں۔ امام ابن ثعلبی ہیں۔ امام

[1] الحجر ۱۴ آیت ۸۷۔

ثعلبی ہیں اسباب النزول میں امام واحدی ہیں۔ سیوطی ہیں یہ تائید کرتے ہیں اور ایک حدیث تائید کرتی ہے اس امر کی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ "نَزَلَتْ فَاتِحَةُ الْكِتَابِ بِمَكَّةَ مِنْ كَنْزٍ تَحْتَ الْعَرْشِ" کہ عرش کے نیچے جو اللہ کا خزانہ ہے۔ اس میں سے سورۃ فاتحہ مکہ میں نازل ہوئی۔ تصریح بھی مل گئی یہ تو ایک قول ہے۔ اب دوسرا قول جو بعض صحابہؓ، بعض تابعینؒ اور علماء سے منقول ہے۔ اس میں یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ مدینہ میں نازل ہوئی۔ یہ قول حضرت ابوہریرہؓ کی طرف منسوب ہے اور اس کے راوی حضرت مجاہدؒ ہیں۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں "اَنَّ اِبْلِيْسَ رَنَّ حِيْنَ فِيْنَا فَاتِحَةُ الْكِتَابِ اُنْزِلَتْ فِي الْمَدِيْنَةِ" کہ ابلیس یعنی شیطان اس وقت چیخا جب سورۃ فاتحہ نازل ہوئی اور سورۃ فاتحہ مدینہ میں نازل ہوئی۔ یعنی اس کی کمر ٹوٹ گئی۔ کہ اب اس امت کو اس سورۃ کے ذریعے ایک ایسا نسخۂ کیمیا مل گیا ہے کہ میرا ہر داؤ اس سورۃ کے ذریعے ناکام کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے چیخا۔ اور کمر ٹوٹ گئی اور یہ مدینہ میں اتری لیکن آئمہ فرماتے ہیں کہ جو آخری حصہ ہے۔ "کہ یہ سورۃ مدینہ میں اتری"۔ یہ امام مجاہد کا اپنا خیال نظر آتا ہے۔ حضرت علیؓ کا یا حضرت ابوہریرہؓ کا نہیں۔ بہرحال یہ دوسرا قول ہے۔ اب ایک تیسرا قول جسے امام زمخشری نے کشاف میں بھی بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں۔ یہ خاص نکتہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ دو بار اتری۔ اور یہ ان دونوں قولوں کی تطبیق ہے۔ اور پھر یہ سورۃ فاتحہ کا الگ ایک امتیاز اور شان ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک بار مکہ میں اتری، ایک بار مدینہ میں اتری۔ دونوں دوروں میں اللہ نے جدا جدا آیتیں نازل فرمائیں۔ اس لئے جو پہلا قول مانتے ہیں وہ بھی درست ہے اور جو دوسری بات مانتے ہیں وہ بھی درست ہے تو مدینہ میں اس کا نزول ثانی تھا۔ دوبارہ اُتری جب بیت المقدس کی بجائے کعبہ کو قبلہ بنایا گیا اس موقع پر اس کا دوبارہ نزول ہوا۔ اب یہ بات تو واضح ہو گئی قرآن مجید کی آیت کریمہ سے اور آخری تطبیق کے قول سے بھی یہ بات طے ہو گئی کہ سورۃ فاتحہ کا نزول مکہ میں ہوا۔

؎ سورۃ فاتحہ اور تعمیر شخصیت ص ۴۲ ؎ سورۃ فاتحہ اور تعمیرِ شخصیت ص ۴۲

اب دیکھنا یہ ہے کہ سب سے پہلے قرآن مجید میں سے کیا نازل ہوا؟ اور ہم جو یہ کہہ رہے ہیں کہ سب سے پہلے سورۃ سورۃ فاتحہ ہے جو نازل ہوئی۔ اس بات کی حیثیت کیا ہے؟ تو یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس موضوع پر چار قول ہیں۔ اوّلیت تنزیل کے مسئلے پر کہ اللہ نے سب سے پہلے کس شے کو نازل کیا قرآن میں۔ اس پر چار قول ہیں۔ سب سے پہلا قول ہے کہ سب سے پہلے نازل ہونے والی وہ پانچ آیتیں ہیں سورۃ علق کی ۱؎ اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ سے لے کر عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ تک یہ پہلی پانچ آیتیں غارِ حرا میں اتریں۔ صحیح بخاری میں حدیث آتی ہے حضرت عائشہ صدیقہؓ روایت فرماتی ہیں۔ یہ بڑی پیاری حدیث ہے۔ ویسے تو محبوب کی ہر بات پیاری ہوتی ہے اس لئے ہر حدیث پیاری ہے اور محبوب کے ذکر کا ہر گوشہ پیارا ہے لیکن یہ حدیث اپنے نفسِ مضمون کے اعتبار سے خاص اہمیت کی حامل ہے۔ آپ فرماتی ہیں۔ کہ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کا زمانہ قریب آیا یعنی نزولِ وحی کے آغاز کو بعثت کہتے ہیں اور وہ چالیس برس کی عمر میں ہوا۔ یاد رکھ لیجئے۔ کہ نبوت کا ملنا اور بعثت کا ہونا دونوں میں فرق ہے۔ خاص طور پر طلباء نوٹ فرمالیں۔ مغالطہ بالعموم یہ پایا جاتا ہے کہ بعثت کو نبوت کا ملنا تصور کیا جاتا ہے۔ یہ بات غلط ہے۔ بعثت نبوت کے ملنے کو نہیں کہتے۔ نبوت کے اعلان کو کہتے ہیں۔ بعثت اس اذن کو کہتے ہیں کہ جس کے ذریعے نبوت کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اور رہ گئی نبوت کی نعمت کا ملنا۔ وہ بعثت سے پہلے بھی ہو سکتی ہے۔ یہ بات آگے چل کر آئے گی۔

تو چالیس برس کی عمر میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نبوت ملی نہیں بلکہ نبوت تو عالم البشریت کے آنے سے بھی بہت پہلے مل چکی تھی۔ عالمِ ارواح سے مل چکی تھی۔ چالیس برس کی عمر میں جو کچھ ہوا نزولِ وحی کے سلسلے کا آغاز ہوا اور یہ حضورؐ کی بعثت ہوئی۔ تو آپ فرماتی ہیں کہ جب وحی کا زمانہ قریب آیا۔ بعثت قریب آئی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خلوت سے اور ویرانوں سے محبت ہونے لگی۔ سبحان اللہ! علامہ اس لئے کہتے ہیں کہ:

۱؎ سورۃ العلق پ ۳۰ آیت ۱-۵

ہوئے ہزاروں سے بڑے اچھے تو ٹھہرے اچھے

یعنی اللہ کے حُسن کے جو جلوے خلوتوں اور تنہائیوں میں نظر آتے ہیں وہ شہر کی جلوتوں اور رونقوں میں کہاں؟ شہر کی زندگی جوں جوں مشینی ہوتی جاتی ہے۔ توں توں فطری حُسن اٹھتا چلا جاتا ہے۔ جب آپ فطری حُسن کی جلوہ گاہ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ پھر دُور۔ رونقوں سے دُور، بیابانوں میں، خلوتوں میں نظر آتا ہے۔ اس لئے بے شک اسلام رہبانیت کے نظام کو رد کرتا ہے۔ پسند نہیں فرماتا لیکن رہبانیت کو قبول نہ کرتے ہوئے بھی خلوت کو ہمیشہ جلوت کے ساتھ ساتھ چلانا چاہتا ہے۔ یہ قاعدہ ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ نری جلوت ہی نہ رہے بلکہ خلوت بھی رہے۔ اور یہ رمضان المبارک کا اعتکاف اُسی خلوت کی ایک علامت ہے اور اُسی خلوت کی ایک یادگار کو قائم کرنا ہے کہ لوگو! کبھی کبھی تنہائی کے گوشے میں بھی بیٹھ کر مزے لے لیا کرو۔ کہ محبوب سے بات کرنے کا جو مزہ تنہائی میں ہے۔ وہ بھری بزم میں نہیں۔ محبوب سے جب خلوت اور تنہائی کی کیفیت ہوتی ہے تو پھر تعلق اور ہمکلامی کے شرف کا عالم ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ پاک بھی جب بندے پر اپنی رحمت کی شان سے قریب ہونا چاہتا ہے تو دن کی جلوتوں میں نہیں بلکہ رات کی خلوتوں میں ہوتا ہے۔ جب لوگ سو جاتے ہیں۔ اور خلوت اور اندھیرا اور تنہائی طاری ہو جاتی ہے تو اس وقت وہ اپنی رحمت اور قرب کی شان سے نزول فرماتا ہے۔ اور آسمانِ دنیا پہ آ کر سوئے ہوئے ان بندوں سے کہتا ہے جو اس کی محبت کا دم بھرتے ہیں۔ کہتا ہے کہ میری محبت کا دم بھرنے والے! کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ محبت کرنے والا سو رہا ہو اور محبوب جاگ رہا ہو۔ اُٹھ یہ کتنی خوبصورت تنہائی کے لمحے ہیں۔ اُٹھ دنیا سو گئی تو بیدار ہو کر مجھ سے کچھ کلام کر۔ یہ تہجد کا راز ہے۔ تہجد کے راز میں عرض کر دیا کہ دنیا سو گئی۔ اب تنہائی کا وقت ہے۔ اُٹھ! اور مجھ سے ہمکلام ہو لے اور دو آنسو میری یاد میں بہا لے۔ اس لئے کہ میں آپ حضرات کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دن میں ہزار نوافل پڑھنے سے وہ کیفیت نہیں ملتی جو تہجد کے لیے شب کی تنہائی کے چند نفلوں سے نصیب ہوتی ہے۔ اس لئے منہاج القرآن کی طرف سے اس عاجز کا ایک پیغام ہے جو دل میں اسے نقش کر لیں کہ جو دوست نماز پنجگانہ کے ابھی پابند نہیں وہ اس درس میں بھی

آئیں اور نماز کے پابند نہ رہیں یہ بات مزے کی نہیں۔ یعنی درس میں بھی چل کر آئیں اور نماز کی حد تک کی پابندی نہ رکھیں۔ اس بات میں مزا نہیں اور جو پابندی اللہ کی نعمت سے ہو چکے ہیں وہ ایک قدم آگے بڑھیں۔ وہ یہیں نہ رُکے رہیں۔ اب وہ تہجد کی پابندی کا انتظام کریں۔ چونکہ[۱] حدیث پاک میں ہے۔ اس مومن کو نقصان ہوا وہ مومن خسارے میں ہے جس کے دونوں دن برابر گزریں۔ یعنی پچھلا دن بیت گیا اور جو دن آج گزر رہا ہے یعنی دو دن برابر گزرے یہ خسارہ ہے۔ ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر بعد کا دن گزرے ہوئے دن سے بہتر ہو۔ انسان اپنے ایمان کی حالت کو بڑھاتا چلا جائے اور ہر پچھلے لمحے سے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ وعدہ بھی یہی ہے۔[۲] "وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ" ۔ محبوب تیری ہر بعد کی گھڑی دوسری گھڑی سے بہتر ہے۔ ہر بعد کی گھڑی پہلی گھڑی سے بہتر ہے۔ سو ایمان کی حالت بھی یہی ہونی چاہیئے۔ ہر شب اگلی شب سے بہتر ہو اور اگلا دن پچھلے دن سے بہتر ہو اور یہ کام ممکن ہے محاسبے سے۔ محاسبۂ نفس سے ممکن ہے۔ اور محاسبۂ نفس کا بہترین وقت رات کی تنہائی ہے۔

حضور[۳] علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسبت حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ فرماتی ہیں کہ جب زمانۂ وحی قریب آنے لگا تو حضور صؐ کو خلوت عزیز ہو گئی۔ ہمیں ایک مضمون کو ایک نشست میں مکمل کرنے کا بہر طور لالچ نہیں ہوتا۔ کیونکہ اللہ پاک کو منظور ہوا تو موضوع تو چلتا ہی رہے گا۔ مجھے لالچ اس بات کا ہوتا ہے کہ جو موضوع شروع ہو۔ اس کے متعلقات جو آ جائیں وہ بھی کھل کر بیان ہوں تاکہ آپ لوگ کچھ لے کر جائیں۔ تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ آپ نے فرمایا کہ جب نزول وحی کا زمانہ قریب آیا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ایک تو خلوت عزیز ہو گئی "حُبِّبَ إِلَيْهِ الْخَلَاءُ"۔ خلوت سے محبت ہو گئی اور حضور علیہ السلام کا دل شہر کی رونقوں سے کبھی کبھی اچاٹ ہوتا اور پہاڑوں اور غاروں کی خلوتوں میں جا کر دل لگتا۔ ایک بات اور دوسرا یہ ہوا اس کے قریب کے زمانے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سچے خواب آنے لگے کہ جو کچھ رات خواب میں دیکھتے وہ دن کے چمکتے ہوئے سویرے کی طرح صحیح ہوتا۔ بیان تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرما رہی ہیں نا۔ حضور علیہ السلام

[۱]

[۲] سورۃ والضحیٰ پ ۳۰، آیت نمبر ۴ [۳] بخاری شریف مترجم جلد اول ص ۹۵

سے مل کر لذتیں دو دور کا تھا! حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا۔ ان کا دور تھا۔ وہ بھی
کیسی خوش نصیب اُم المومنین تھیں جنہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ان لذتوں اور حلاوتوں،
ایمانی اور روحانی لذتوں اور حلاوتوں کا زمانہ پایا۔ اور پچیس برس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ
گزارے۔ اور یہ دور اوائل اسلام کا دور تھا۔ اوائلِ اسلام سے پہلے کا بھی اور اوائل اسلام کا
دور بھی پایا۔ وہ کبھی سات دن کے لئے کبھی دس دن کے لئے۔ کبھی مہینے کے لئے اور کبھی
چالیس دن کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام غارِ حرا میں چلے جاتے اور وہاں خلوت نشین ہوتے۔
سو صوفیائے کرام کی زندگی کے بارے میں آپ نے سُنا ہے نا کہ وہ چلہ کشی کبھی کبھی
کرتے ہیں کہ چالیس چالیس دن کسی غار میں کسی جگہ چلہ کرتے ہیں۔ سُنا ہے یا نہیں! یہ بابا
فرید گنج شکر کی چلہ گاہ ہے۔ یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی چلہ گاہ ہے۔ حضرت داتا
گنج بخش کے پائیں کی طرف ہے کہ نہیں۔ یا حضرت قطب الدین بختیار کاکی کی چلہ گاہ ہے۔ دہلی میں یہ
حضرت نظام الدین اولیاء کی چلہ گاہ ہے۔ یہ سنتے ہیں۔ تو چلہ گاہ کا معنیٰ کیا ہے؟ وہ جگہ جہاں
اللہ کا کوئی درویش بندہ چالیس دن اور راتیں بیٹھ کر خلوت میں عبادت کرے۔ یہ چلہ گاہ
ہے تو یہ چلہ کا تصور صوفیاء نے کہاں سے لیا؟ یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حرا کی خلوتوں سے۔
یہ حضور علیہ السلام کی سُنت ہے۔ حِرا کی خلوتوں سے لیا ہے۔ تو چالیس چالیس دن حضور صلی اللہ
علیہ وآلہٖ وسلم وہاں گزارتے۔ جب بعثت ہو گئی اور اعلان نبوت کے بعد ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ تو
اتنا اتنا وقت نکال کر خلوت میں جانا تو ممکن نہ رہا لیکن اس یاد کو چھوڑ دینا بھی ممکن نہ تھا۔ سو اس
کی یاد ہر سال تازہ کرتے اور دس دن اعتکاف کے بیٹھتے اور خلوت میں بیٹھ کر مولیٰ کی یاد پھر تازہ
کرتے رہتے۔ باوجودیکہ وہ یاد حضورؐ کی ہر دم تازہ رہتی اس میں کبھی کمی نہ آتی تھی لیکن خلوت
کی یاد پھر خلوت کی یاد تھی۔ تو ایسی کیفیت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام غارِ حرا میں تھے اور وہاں
جا کر کیا کرتے۔ حدیثِ پاک میں جو الفاظ آئے ہیں وہ "تحنث" کے آئے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام
"تحنث" فرماتے اور تحنث یہ ہے کہ دن کو رات کو عبادت کرتے رہنا۔ ذکر و فکر اور مراقبے
میں مصروف رہنا۔ ذکر اور مراقبہ میں فکر اور مراقبے میں مگن رہنا۔ یعنی انہماک کی کیفیت میں۔
استغراق کی کیفیت میں۔ اسی طرح کسی نے خوب کہا ہے کہ؎

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار

جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

تو گردن جھکا کے یار کے حُسن کو تکتے رہنا۔ یہ "تحنُّث" ہے۔ فکر کرنا، مراقبہ کرنا۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ملتِ ابراہیمی پر مراقبہ کرتے تھے۔ اُس وقت ملتِ ابراہیمی پر مراقبہ فرماتے۔ تو یہ تحنُّث تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی عبادت میں ذکر، فکر اور مراقبہ حضورؐ کی عبادت تھی۔

اسی کیفیت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک وقت گزارا تا آنکہ محبوبِ حقیقی کا پیغام آیا اور سلسلۂ وحی کا آغاز ہوگیا۔ وہ عشقِ الٰہی جو پیکرِ نبوت میں چالیس برس سے پک رہا تھا اس بشری پیکر کے اندر اور اس بشری جسم کے اندر۔ وہ عشقِ الٰہی کی آگ جو چالیس برس سے پک رہی تھی۔ وہ پکتی رہی، پکتی رہی بالآخر وہ وقت آیا کہ محبوب کی آواز سنائی دی۔ اور جبرائیل امین آئے اور آ کے کہا "اِقرأ"۔ حضورؐ پڑھیئے کیا؟ "اِقرأ" پڑھیئے۔ میں یہ عرض کر رہا تھا۔ دیکھیئے بات ہم پہلے قول کی کر رہے ہیں۔ کہ سب سے پہلے کیا نازل ہوا؟ اور اس قول کے مطابق سب سے پہلے "اِقرأ بِاسمِ رَبِّكَ الَّذِی خَلَقَ" کی سورۃ نازل ہوئی۔ بات اس قول کی ہے لیکن اس کے حدیث میں جو کچھ معارف بیان ہوئے۔ میں نے ضروری سمجھا کہ اس موقع اور محل کی مناسبت سے اس پر روشنی ڈال دوں۔ ایک بڑا اہم نکتہ ہے اور جس کی نسبت بڑا مغالطہ ہمارے ذہنوں میں پایا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ جبرائیل امین اترے اور انہوں نے اُتر کر کیا کہا اِقرأ۔ صحیح بخاری میں موجود ہے اور آپ لوگوں نے اپنے سکولوں اور کالجوں میں اور عام کتابوں میں یہ حدیث بار بار پڑھی ہوگی کہ جواب میں حضور علیہ السلام نے فرمایا: "مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ"۔ اور ترجمہ اس کا یہ کیا جاتا ہے کہ میں پڑھا ہوا نہیں۔ یہی کیا جاتا ہے نا! اور عام طور پر اساتذہ سکولوں اور کالجوں میں یہی پڑھاتے ہیں۔ انہوں نے کہا اِقرأ۔ پڑھیئے اور حضور علیہ اسلام نے جواب میں کہا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ یہ ترجمہ اس مقام پر غلط ہے۔ اس کا معنی ہے میں پڑھنے والا نہیں ہوں۔ اور جب جبرائیل امین نے یہ سُنا تو انہوں نے اپنے بازوؤں میں لے

[1] بخاری شریف مترجم جلد اوّل ص ۹۵ کتاب الوحی [2] سورۃ العلق پ ۳۰ آیت نمبر ۱

کر حضورؐ کے جسدِ اقدس کو بھینچا اور پھر دوبارہ کہا "اِقراءْ ۔ پڑھیئے۔ حضورؐ نے پھر وہی جواب دیا کہ میں پڑھنے والا نہیں ہوں ۔ انہوں نے پھر بازوؤں میں لے کر بھینچا پھر کہا ۔ حضورؐ نے پھر یہی جواب دیا۔ تین بار انہوں نے ایسا کیا ۔ اب اس پر میں نے کیوں یہاں کہا کہ وہ ترجمہ اس مقام پہ درست نہیں ۔ وہ بھی سمجھ لیجئے ۔ اس کی وجہ کہ اگر ایک شخص بالکل اَن پڑھ ہو ۔ چٹا اَن پڑھ ہو ۔ ایک حرف بھی پڑھا ہوا نہ ہو اور اسے ایک شخص کہے اقراءُ یہ کہہ ۔ تو بالکل ان پڑھ سہی ۔ تو کیا سن کر اقراءُ کا لفظ نہیں بول سکے گا ۔ بو لیئے ! کہ کہا جائے اقراءُ پڑھو ۔ اقراءُ کے جواب میں اقراءُ ہی کہنا تھا نا ۔ آپ میری بات کو سمجھ رہے ہیں نا ۔ تو وہ اقراء سُن کر کیا دنیا کا کوئی ایسا بھی ان پڑھ ہے اور ایسا کند ذہن شخص بھی کوئی ہو سکتا ہے جو اقراءُ ایک چھوٹا سا لفظ سن کر دہرا نہ سکے ۔ آپ چار سال کے بچے کو استاد کے پاس بٹھاتے ہیں تو وہ بھی تو پہلا لفظ بولتا ہی ہے نا ! اسے بھی کہیں نا اقراءُ وہ بھی کہہ دے گا اقراءُ ۔ گھر جا کے آزما کے دیکھ لیجئے ۔ چار پانچ سال کے بچے کو پکڑ لیں جس نے کچھ نہیں پڑھا ۔ اُس کو کہیں ؛ بیٹے ! کہہ اقراء ۔ وہ بھی کہے گا اقراءُ ۔ تو کسی نہ کسی شکل میں تو کہہ لے گا ۔ تو کیا اقراء کا لفظ سُن کر جواباً اقراء کہنے کی بجائے یہ کوئی بات بنتی ہے کہنے کی کہ میں پڑھا ہوا نہیں ۔ اگر نہیں پڑھے ہوئے تو پڑھایا جا رہا ہے ۔ تو اقراء کہنے میں کیا تامل ہے ۔ ایک بات کے حوالے سے کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں ۔ یہ جواب اس موقعہ پر مناسب نظر نہیں آتا ۔ تو ایک لفظ پڑھانا چاہتے ہیں اور آپؐ فرماتے ہیں میں پڑھا ہوا نہیں ہوں ۔ اور پھر تین بار بھینچا جا رہا ہے ۔ بار بار یہی ماجرا دہرایا جا رہا ہے ۔ مقصد یہ ہے ۔ یہ تو حضورؐ نے فرمایا ہی نہیں تھا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں بلکہ حضورؐ خالی اقراء پڑھنا نہیں چاہتے تھے ۔ خالی اقراءُ پڑھنا نہیں چاہتے تھے اور جب جبرائیل امین نے اس Process کو Repeat کیا تو وہ سمجھ گئے کہ زبانِ نبوت پہلی بار رَب کے نام کے بغیر فقط لفظ اقراءُ پر کھلنا نہیں چاہتی ۔ خالی اقراء کہنے کی بجائے پوری آیت ہی پڑھ لی فرمایا : "[1] اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ

[1] سورۃ العلق پ ۳۰ آیت ۱ تا ۵

مَا لَمْ یَعْلَمْ تک پوری آیت پڑھ دی یا پانچوں آیتیں پڑھ دیں کہ جب آگے پڑھ دیا اب کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی بغیر تامل کے پڑھنے لگے۔ اب میں یہاں سوال کرتا ہوں کہ اس سے قطع نظر اس واقع سے ایک شخص اگر ان پڑھ ہو تو اس کے لئے ایک لفظ سُن کر پڑھنا زیادہ مشکل ہے یا پورے جملے سُن کر پڑھ دینا زیادہ مشکل ہے بھائی جو ایک خالی لفظ اقرأ نہیں پڑھ سکتا وہ پانچوں آیتیں کس طرح پڑھ سکتا ہے لیکن جب خالی اقرأ تھا تو نہیں پڑھتے اور جب پورے جملے ہو گئے تو بغیر تامل کے سارے پڑھ دیئے۔ حالانکہ انسان بھول جاتا ہے نہ پڑھا ہوا ہو تو دو جملے اگر پڑھ کر یک وقت کہے جائیں اور کہا جائے کہ دہراؤ تو لفظ کا فرق آسکتا ہے۔ لیکن جب پورے جملے پڑھ دیئے تو سارے دہرا دیئے۔ ایک لفظ تھا تو فرماتے تھے مَا اَنَا بِقَارِیٔ۔ پتہ یہ چلا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ کہ جبرائیل! یہ زبانِ نبوت چالیس سال کے انتظار کے بعد آج پہلی بار کھلنا چاہتی ہے اور یہ چاہتی ہے کہ پہلی بار کھلے تو اپنے رَب کے نام سے کھلے اور وہ خالی اقرأ کہتے تھے۔ اقرأ کا معنی ہے پڑھ۔ اب خالی اقرأ کے اندر تو رَب کا نام تو نہیں آیا۔ فرمایا اقرأ باسم ربك الذی خلق۔ پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ جب رَب کا نام آیا تو زبانِ نبوت گویا ہوئی، بول اٹھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ جس کو اُمی کا مفہوم غلط سمجھتے ہوئے نہ پڑھا ہوا سمجھا جا رہا ہے۔ وہ سب کچھ پڑھا ہوا تھا اس کا یہ پتہ تھا کہ خالی اقرأ کیوں پڑھوں۔ اس وحی کو پورا سن لینے دیں آگے رب کا نام آ رہا ہے۔ رب کا نام آیا تو پڑھا۔ تو اُمّی کا معنیٰ ہم کرتے ہیں نا معاذ اللہ ان پڑھ۔ اُمی کا معنیٰ ان پڑھ نہیں ہے۔ آپ مفردات امام راغب علماء کی تحقیق کی کتابیں اٹھا کر دیکھ لیں۔ اُمی کا معنیٰ ہے وہ جو کسی دنیاوی کتاب اور استاد سے نہ پڑھا ہوا ہو۔ ان پڑھ کو نہیں کہتے جو دنیا کے کسی استاد اور کتاب سے نہ پڑھا ہوا ہو اس کو امی کہتے ہیں جو سب کچھ رب سے پڑھ کر آیا ہو وہ اُمی ہوتا ہے۔ اور پھر اُمی اُم سے ہے۔ اُم کہتے ہیں اصل کو۔ اُم کہتے ہیں اصل اور جڑ کو جو اپنی اصل پر قائم ہو۔ اسے امی کہتے ہیں اور نبی کا علم اصل پر قائم ہوتا ہے اور نبی کے علم کی اصل اللہ کا علم ہوتا ہے۔ وہ سب کچھ اللہ سے پڑھتا ہے۔ "اَلرَّحْمٰنُ o عَلَّمَ ...[1]

[1] سورۃ الرحمٰن پ۲۷، آیت ۱ تا ۳

عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ o عَلَّمَهُ الْبَيَانَ o وہ دنیا کی کسی کتاب سے نہیں پڑھتا کسی استاد سے نہیں پڑھتا بلکہ وہ پڑھتا ہے تو فقط رب سے پڑھتا ہے۔ [1] وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا o تو یہ وحی اتری تو اس طرح اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۔ تو یہ آیت اور یہ آیتیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر سب سے پہلے آیتیں بن کر اتریں اور اس آیت کے ذریعے حضورؐ کی عشق الٰہی کی کیفیتوں کی تصدیق ہوئی۔ اس سے پہلے حضورؐ منہمک رہتے ۔ مستغرق رہتے ۔ عشقِ الٰہی اور یادِ الٰہی میں مگن رہتے اور اتنے مگن رہتے کہ کھانا پینا بھول جاتے جو چند دنوں کا لے جاتے کھانا ختم ہو جاتا لیکن چالیس چالیس دن محبوب کی یاد میں مست رہتے اور کئی بار حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے یہ گمان کر کر اتنے دن کا کھانا لے کر گئے تھے اور آج اتنے دن گزر گئے ۔ خدا جانے وہاں کیا ہوتا ہوگا ۔ وہ پیچھے آجاتیں لیکن وہاں جسے یادِ الٰہی کی خوراک مل رہی ہو وہ اس خوراک کو کیا جانے؟

تو مست تھے حضور علیہ السلام حتیٰ کہ خود رفتہ ہو گئے ۔ رب کے عشق میں خود کو بھول گئے تھے ۔ اپنا کھانا پینا بھول گئے تھے ۔ شہر کی رونقوں کو بھول گئے تھے کہ رب کی یاد میں ایسے مست ہوئے اور جب وحی اتری اور محبوب سے علاقہ وحی اور کلام کا قائم ہو گیا تو رب نے اس طرف اشارہ کیا ۔ [2] وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى o محبوب! ہم نے تمہیں اپنے عشق اور محبت خود رفتہ پایا ۔ پس جب تو اس مقام پہ پہنچا تو ہم نے تجھے اپنی راہ عطا کی ۔ اپنی راہ عطا کر دی ۔ فَهَدٰى ۔ اپنی راہ عطا کر دی ۔ اور ہم لوگ جو نا سمجھ ہیں اور مقام نبوت کو بعض اوقات نہیں سمجھتے تو وہاں ضآلاً کا ایک مفہوم چونکہ عام طور پہ چونکہ گمراہ ہونا بہک جانا بھی ہے کہہ بیٹھتے ہیں ۔ کہ ہم نے تجھے راہ حق سے بے خبر پایا معاذ اللہ استغفراللہ راہ حق سے بے خبر پایا معاذ اللہ گم گشتہ راہ پایا ۔ معاذ اللہ ۔ یعنی تجھے راہ بھولا ہوا پایا پس تجھے راہ دی ۔ اے ناداں انسان یہ جو شہر کی جلوتیں چھوڑ کر غارِ حرا میں آکر چالیس چالیس دن رب کی یاد کر رہا ہے ۔ یہ راہ بھولا ہوا ہے یا راہ پر چل رہا ہے ۔ اس کو راہ بھولا ہوا!

[1] سورۃ النساء پ ۵ آیت ۱۱۳ [2] سورۃ والضحیٰ پ ۳۰ آیت ۷

ہے ہیں یا جو کھانا پینا چھوڑ کر رب کی یاد میں مست ہے اور فکر و مراقبہ میں مست ہے اس کو راہ بھولا ہوا کہتے ہیں یا راہ پایا ہوا کہتے ہیں ؟ یہ راہ پا یا ہوا ہے تو یہاں بیٹھا ہے ۔

تو حضور ﷺ کبھی بھی راہِ حق سے بے خبر نہ تھے ۔ یہاں ضالاً کا معنی یہ ہے کہ ہم نے تجھے اپنے عشق اور محبت میں مست ، بے خود پایا اور راہ کو بھولا ہوا نہیں خود کو بھولا ہوا پایا ۔ ضالاً کا معنیٰ ہے بھولا ہوا ۔ ضالاً کا معنیٰ ہے بھولا ہوا ۔ لیکن کیسے بھولا ہوا ؟ راہِ حق کو نہیں ۔ اپنی ذات کو بھولا ہوا پایا ۔ تجھے اپنے عشق ، محبت میں ایسا غرق پایا کہ تو خود کو بھول گیا تھا ۔ کیا کھانا ، کیا پینا ۔ اور یہ کیفیت محبت میں ہوتی ہے یا نہیں ۔ یہ ہوتی ہے یا نہیں ؟ یہ ہوتی ہے ۔ تو تجھے خود کو بھولا ہوا پایا جب تیری محبت اس مقام پہ پہنچی ۔ فھدیٰ پس ہم نے تجھے اپنی راہ عطا کر دی ۔ اپنی راہ عطا کر دی ۔ شرفِ لقاء عطا کر دیا ۔

حاضرینِ محترم ! تو یہ تو پہلا قول تھا اولیت تنزیل کے متعلق کہ سب سے پہلے سورۃ اقرأ باسم ربک الذی خلق نازل ہوئی یہ اس کی آیت ۔ اس کے بعد اب دوسرا قول آتا ہے دوسرے قول کے مطابق اب اکثر صحابہ تابعین نے مختلف مقامات پر اس کو روایت کیا ہے ۔ دوسرا قول سنیئے دوسرا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے سورۃ مدثر نازل ہوئی ۔ کون سی ؟ سورۃ مدثر نازل ہوئی ۔ اب اس کے لئے حدیث پاک میں آتا ہے ۔ یہ بھی بخاری اور مسلم میں ہے ۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے[1] حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا ۔ بلکہ ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن نے پوچھا ۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے جابر بن عبداللہ سے پوچھا کہ سب سے پہلے قرآنِ مجید میں کیا اترا ۔ انہوں نے جواب دیا کہ سب سے پہلے قرآن مجید میں " یاایھا المدثر " ۔ اسی پر ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ کیا " اقرأ باسم ربک الذی خلق " نہیں اتری سب سے پہلے ۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں تمہیں وہ بات بتا رہا ہوں جو مجھے حضور علیہ السلام نے بتائی اور مجھے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بتایا کہ میں غارِ حرا میں خلوت نشین ہوا اور ایک مہینہ پورا ایک مہینہ غار میں جا کر خلوت نشین رہا ۔ گوشہ نشین رہا ۔ مہینہ گذرنے کے بعد ۔ یہ اس

[1] سورۃ فاتحہ تعمیر شخصیت ص ۴۵

حدیث پاک کا مضمون سمجھ لیجئے۔ "میں جب نکلا گھر جانے کے لئے تو میں وادی سے گزر رہا تھا۔ اس میں نزولِ وحی کے دور کے آغاز کا بھی کچھ بیان آجائے گا۔ یہ بھی سمجھ آئے گی کہ کس طرح بعثت ہوئی۔ جب میں غارِ حرا سے نکل کر گزر رہا تھا وادی سے تو اس وقت اس وادی میں کسی نے مجھے ندا دی۔ کسی نے مجھے آواز دی، پکارا۔ تو میں نے آواز سن کر اپنے دائیں بائیں اوپر نیچے ہر طرف دیکھا۔ آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ میں نے پھر سر اوپر اٹھا کر دیکھا تو میں نے دیکھا کہ یہ وہی فرشتہ تھا جو حرا میں میرے پاس آیا۔ وہی فرشتہ تھا پس یہ کیفیت دیکھ کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جسدِ اطہر پر ایک کپکپی، بتقاضائے بشریت ایک کپکپی کی کیفیت طاری ہوئی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں میں گھر آیا اور میں نے حضرت خدیجہؓ سے کہا۔ "فدثرونی"۔ مجھے کپڑا اوڑھا دے، چادر اوڑھا دو۔ کپکپی کی کیفیت ہے پس انہوں نے مجھ پر چادر اوڑھ دی اور جب میں چادر اوڑھ کر لیٹا۔ چادر اوڑھ کر لیٹا۔ چارپائی پر یا اپنے بستر پر چادر اوڑھ کر لیٹا تو محبوبِ حقیقی کا یہ پیغام آیا۔ "یا ایہا المدثر"۔ اے چادر اوڑھ کر لیٹنے والے پیارے! اے چادر اوڑھ کر لیٹنے والے پیارے! آپ دیکھئے جہاں محبت کا تعلق ہوتا ہے۔ کیسے کیسے لفظوں سے یاد کیا جاتا ہے۔

اللہ کا تعلق اپنے محبوبؐ سے محبت کا تعلق ہے۔ "یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ"[1] کہ اے چادر اوڑھ کر لیٹنے والے پیارے قُمْ فَاَنْذِرْ۔ اٹھ کھڑا ہو اور جو اللہ کی ذات سے باغی اور سرکش ہو چکے ہیں۔ انہیں میرا ڈر سنا دے۔ قُمْ فَاَنْذِرْ۔ اٹھ کھڑا ہو اور سرکش اور باغیوں کو اللہ کا ڈر سنا دے۔ تو یہ حدیث پاک ہے۔ اب اس حدیثِ پاک کی رو سے یہ قول علماء نے لیا کہ سب سے پہلے سورۃ مدثر نازل ہوئی۔ اب تطبیق ہم بعد میں کریں گے لیکن ساتھ ہی ساتھ بات سمجھ میں بھی آتی جاتی ہے کہ یہاں اس حدیث کے اندر آپ نے یہ جان لیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ کہ وہ سورۃ مدثر کب پر نازل ہوئی لیکن ساتھ یہ بھی بتایا کہ یہ وہی فرشتہ تھا جو غارِ حرا میں آیا تھا۔ اس سے مطلب یہ معلوم ہوا کہ وہ غارِ حرا میں بھی اس سے پہلے ایک بار آچکا تھا۔ وہ اقرأ باسم ربک الذی کی طرف اشارہ ہے۔

[1] پ ۲۹، سورۃ المدثر، آیت ۱،۲۔

تیسرا قول جو امام واحدیؒ اسباب النزول میں بیان فرماتے ہیں وہ بسم اللہ تا رحیم ٥ کی نسبت ہے کہ سب سے پہلے بسم اللہ نازل ہوئی اور بسم اللہ تا رحیم ٥ ایک اعتبار سے سورۃ فاتحہ کا حصہ بھی ہے۔ یا قرآنِ مجید کی سورۃ کا آغاز بھی ہے تو یہ اور سورۃ فاتحہ کا نازل ہونا یا کسی بھی اور سورۃ کا نازل ہونا ایک ہی تصور کیا جا سکتا ہے۔

اب چوتھا قول وہ ہے کہ سب سے پہلے سورۃ فاتحہ نازل ہوئی۔ سب سے پہلی سورۃ۔ یہ حدیث پاک میں آئی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جب میں خلوت میں تھا۔ غارِ حرا کی خلوت میں جاتا اور واپس گھر کو لوٹتا تو ایک روز ایسا ہوا کہ میں خلوت نشینی کے بعد واپس گھر آ رہا تھا اس تنہائی کی کیفیت میں مجھے پیچھے سے ندا آئی۔ بڑے پیار سے یا محمدؐ۔ مجھے ندا آئی یا محمد! فرماتے ہیں میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو جب مڑ کر دیکھا میں نے جواب میں کہا: لبیک!

اے کہنے والے میں حاضر ہوں، کیا کہتا ہے؟ تو جواب آیا "قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ حتیٰ بلغ وَالضَّالِّيْنَ ٥ جب میں نے مڑ کر دیکھا، متوجہ ہوا تو اس کہنے والے نے کہا: کہہ! اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ پھر پوری سورۃ پڑھ کر غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ ٥ تک سبق دہرا دیا اور اکثر مفسرین اس بات کے قائل ہیں کہ یہ پہلی سورۃ تھی جو حضور علیہ السلام پر نازل ہوئی۔

اب تین قول گویا ہمارے سامنے آ گئے۔ ان چار قولوں کو ان تین قولوں میں ہم بدلتے ہیں کہ بسم اللہ کا سب سے پہلے نازل ہونا وہ سورۃ فاتحہ کی سورۃ میں بھی درست ہے کیونکہ اس سے پہلے پڑھی جاتی تھی۔ اور کوئی سورۃ ہو تب بھی ممکن ہے کیونکہ بسم اللہ سے تو اللہ کے کلام کا آغاز ہوتا ہے۔ تو تین قول آ گئے سامنے۔ ایک قول یہ آیا کہ سب سے پہلے اقرأ باسم ربک الذی" کی آیتیں اتریں۔ دوسرا قول آیا کہ سب سے پہلے یاایھا المدثر کی سورۃ اتری۔ تیسرا قول آیا کہ سب سے پہلے سورۃ فاتحہ اتری۔ جب یہ تین قول آ گئے، تو ہم نے ان کی تطبیق بیان کرنے اور معلوم کرنے کے لئے آج کے درس کا یہ موضوع بنایا۔

کیوں؟ تاکہ ایک مثال آپ کے سامنے پیش کر کے کہ ایک مسئلہ پر تین مختلف قول ہیں۔ ہیں یا نہیں؟ اب جو ضرورت محسوس ہوئی آج کے درس کا موضوع اس مسئلے کو بنانے کی وہ سمجھ لیجئے۔ وہ ضرورت یہ تھی کہ جس طرح آپ نے دیکھا کہ اسی ایک مسئلے پر کہ سب سے پہلے کیا نازل ہوا؟ آپ کو تین مختلف

؎ سورۃ فاتحہ تعمیرِ شخصیت ص ۴۶

دل مل گئے نا۔ احادیث سے اسی طرح ایک مسئلہ پر احادیث کو اگر پڑھیں اور آثارِ صحابہ اور تابعین کا مطالعہ کریں۔ اور ائمہ اور بزرگانِ دین کا اور اکابرِ امت کا کہ اقوال، تحقیقات کا مطالعہ کریں تو کئی مقامات پر ایک مسئلہ پر مختلف قول ملتے ہیں۔ احادیث بھی مختلف ملتی ہیں۔ تو وہ لوگ جو دل سے حدیث کو اور اسلام کو ماننا نہیں چاہتے اور جن کے دل میں مدغ ہے اور جو اسلام کی نسبت اور حدیثِ نبوی کی نسبت اور اکابر اور ائمہ اسلام کی نسبت ہمارے ذہنوں میں شکوک و شبہات ڈالنا چاہتے ہیں۔ اور ہمارے اعتقاد کو متزلزل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ہمیں پریشان کرنے کے لئے اور ہمارے اعتقاد میں شکوک کی دراڑیں ڈالنے کے لئے۔ کیا کہتے ہیں؟ دیکھو جی کیا مانیں؟ کس حدیث کو مانیں؟ فقط قرآن کی بات کرو تو کوئی بات بھی ہے۔ آپ حدیثوں کی بات کرتے ہیں۔ ایک حدیث یہ کہتی ہے

ایک یہ کہتی ہے۔ کس کو مانیں یا کس کو نہ مانیں؟ اور جب وہ حدیثیں بیان کر دیتے ہیں اور بعض مختلف بیان کر دیتے ہیں۔ تو ایک عام شخص (Layman) جو فنِ حدیث سے واقف نہیں اور فنِ تطبیق کا واقف نہیں کہ مختلف اقوال کا معنیٰ کیا تضاد ہوتا ہے؟ یا ایک ہی حُسن کے مختلف جلوؤں کو نکھارنا ہوتا ہے۔ جب مختلف قول آتے ہیں۔ جب ایک ہیرا ہو نا ہیرا اُس کی کئی جہتیں ہوتی ہیں تو اب اس کو مختلف جہتوں سے دیکھو تو مختلف رنگوں کی شعاعیں نکلتی ہیں۔ مختلف رنگوں کی جھلک نکلتی ہیں، شعاعیں نکلتی ہیں۔ اب چاہو تو یہ کہہ لو کہ جی وہ کہتا ہے کہ ہیرے سے اس رنگ کی جھلک آتی ہے۔ وہ کہتا ہے نہیں میں نے آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اس رنگ کی جھلک کی۔ وہ کہتا ہے میں نے آنکھوں سے دیکھا ہے اس رنگ کی جھلک آتی ہے۔ تو چوتھا آدمی سُن کر کہے کہ میں ماننا ہی نہیں۔ بھائی تیری مانوں، تیری مانوں، تیری مانوں۔ تو کہتا ہے کہ سُرخ جھلک پڑتی ہے۔ تو کہتا ہے کہ نیلی جھلک پڑتی ہے۔ تو کہتا ہے سبز جھلک پڑتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جھلک کا قصہ ہی نہیں ہے۔ سب باتیں ہیں۔ تو صاف ظاہر ہے۔ ایک ہی جھلک ہو گی۔ ایک تو یہ زاویۂ نگاہ ہے کہ اقوال کو مختلف دیکھ کر انسان حقیقت کے حُسن کا انکار کر دے۔ اور ایک یہ زاویۂ نگاہ ہے کہ نادان حقیقت کا انکار نہ کر یہ اقوال مختلف ضرور ہیں، متضاد نہیں۔ مختلف ضرور ہیں متضاد نہیں ہیں۔ تضاد میں خرابی ہے اختلاف میں حُسن ہے۔ تضاد میں قباحت ہے اور اختلاف میں حُسن ہے۔ جس طرح ایک ہیرے سے مختلف سمتوں سے ایک ہیرہ مختلف رنگوں کی جھلک دیتا ہے اور رنگوں کے اختلاف سے

اس کا کمال گھٹتا نہیں ہے بلکہ بڑھتا ہے کہ اتنا حسین ہیرا ہے کہ جس سمت سے دیکھو نیا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ بالکل اسی طرح اختلافِ اقوال سے حدیثِ رسولؐ کی عظمت گھٹتی نہیں بڑھتی ہے کہ ہر ہر حدیث اتنی باکمال ہے کہ جس رُخ سے دیکھو، نیا رنگ نظر آتا ہے۔ اِس رخ سے دیکھو نیا رنگ نظر آتا ہے۔

یہ اختلاف اقوال دراصل احادیثیں ہیں رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ہیروں کو، چمکوں کو اور موتیوں کو ظاہر کرتی ہیں کہ جس نے اس رخ سے دیکھا اس نے یہ قول کہہ دیا اور جس نے اس رخ سے دیکھا یہ قول کہہ دیا۔ جس نے ادھر سے دیکھا وہ قول کہہ دیا۔ یعنی حُسن ایک ہے لیکن جھلکیں جدا جدا ہیں۔ یہ جو مختلف اقوال ہیں تعددِ اقوال ان کی تطبیق کو سمجھنا چاہیئے۔ ان کی تطبیق کو سمجھنا چاہیئے تاکہ سمجھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ ان مختلف اقوال کو جب یکجا کر کے جب بات آئے گی تو ارشادِ رسولؐ اور حدیث نبویؐ اور اِسلام کی تعلیمات کی عظمت کا رنگ ہی جدا ہوگا۔ اُس کمال کا رنگ ہی جدا ہوگا۔ اور اگر ان کی حکمت کو سمجھے بغیر سرسری نگاہ ڈالی جائے گی تو آپ اپنے باطن کی خرابی کی بنیاد بنا ڈالیں گے کہ اُس کی مانیں، اُس کی مانیں یا اُس کی مانیں۔ اور یہ بات آپ یوں بھی سنتے ہوں گے کہ جی کوئی کہتا ہے ہاتھ باندھ کر نماز پڑھو۔ کوئی کہتا ہے سینے پر رکھو۔ کوئی کہتا ہے ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھو۔ یہ کیا مصیبت ہے نماز تو ایک ہی طریقے سے پڑھی ہوگی حضورؐ نے۔ سو اِس کی مانیں، اس کی مانیں کس کی مانیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ کسی کی بھی نہ مانو۔ یہ میں آپ کو سوچ کا فتور عرض کر رہا ہوں۔ یہ بہت بڑی ایک مرض ہے۔ یہ ایک سوچ کا رخ ہے کہ اختلافِ اقوال اور اختلافِ تحقیقات کو اسلام کے انکار کی دلیل بنانا۔ یہ خُبث باطن ہے۔ یہ اندر کی خرابی ہے۔ ایک رخ یہ ہے سوچ کا۔ ایک رُخ میں نے دوسرا آپ کے سامنے کر دیا۔ کہ جہاں مختلف اقوال نظر آئیں۔ یہ بھی ایک کیفیت ہے کہ حسن چھوٹا ہو تو ایک ہی رنگ دیتا ہے۔ حُسن بڑا جامع ہو تو ہر طرح سے جدا جدا رنگ دیتا ہے۔ یہ جتنا حسین ہوگا جب آپ پیکرِ حسین کو بار بار نگاہ ڈالیں گے تو ہر بار اس کے حُسن کے جلوے نئے رنگ دکھائیں گے، نئے رنگ دکھائیں گے۔

آپ جب ایک شاعر کا شعر سنتے ہیں اور شعر بڑا باکمال شعر ہو۔ جتنی بار سنتے ہیں وہ لوگ جو اہلِ ذوق ہیں اور جن کو ادب کے ساتھ شغف ہے اور خاص طور پر شاعری کے ساتھ شغف

ہے۔ یہ ان کے سمجھنے والی بات ہے۔ شعر اگر کمال درجے کا ہو تو کیا اس کی خوبیوں میں سے یہ
اس کی خوبی نہیں ہوتی کہ جب بھی سنو، ہر بار نیا لطف دیتا ہے۔ اور جب بھی سوچو ہر بار نیا مفہوم
سامنے آتا ہے اور کئی کئی مفاہیم اساتذہ نکالتے ہیں تو کیا متعدد مفاہیم کے نکلنے سے اس شعر کا حسن
گھٹے گا یا بڑھ جائے گا؟ یہ تو شعر کی بات تھی اور ہم کرتے ہیں حضورؐ کی حدیث کی بات کہ کروڑوں شعر قربان
ہو جائیں تو حدیثِ رسولؐ کی عظمت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

تو یہ مختلف اقوال دراصل مختلف جہتیں ہیں۔ اس حسن کی مختلف سمتیں ہیں۔ مختلف تعبیرات
ہیں اور اگر نماز بھی کسی نے ہاتھ باندھ کر پڑھی، کسی نے چھوڑ کر پڑھی، کسی نے سینے پر باندھ
لئے ہاتھ۔ کسی نے رفع یدین کر لیا، کسی نے نہ کیا۔ یہ اسلام کے انکار کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ چاہیے
یہ کہ جس ایک طریقے کو اپنا لو، گڈمڈ نہ کرتے پھرو۔ کبھی ایسا کرو، کبھی ایسا کرو۔ جس طریقے پر جس
تحقیق اور اجتہاد پر آپ کا اعتماد ہے، اسے اپنا لو، اسی کو تقلید کہتے ہیں۔ اس راہ پر چل پڑو۔
لیکن اس تعداد اقوال کو حسن سمجھو، قباحت نہ جانو۔ اس لئے کہ ہر بات کے سوچنے کے کئی رخ
ہوتے ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ جس کو تم اسلام کے انکار کا پہلو سمجھ رہے ہو وہ یہ بات ہو کہ مختلف
دوروں میں، اور مختلف وقتوں میں اور مختلف مقامات پر حضورؐ نے مختلف اداؤں سے نماز
پڑھی ہو۔ بتقاضائے حالات اور رب نے چاہا ہو۔ محبوبؐ جیسے بھی پڑھی تھی، تھی تو تیری
ادا۔ قیامت تک محفوظ کرتا ہوں۔ چھوڑ کے پڑھی وہ بھی ادا محفوظ ہو گئی، باندھ کر پڑھی
وہ بھی ادا محفوظ ہو گئی۔ رفع یدین کیا، وہ ادا بھی محفوظ ہو گئی، ترک کر دیا وہ بھی ادا محفوظ
ہو گئی۔ یہ تو سوچ کے اپنے اپنے رخ ہیں اگر دل میں نور ہو، ایمان کا تو زاویہ نگاہ بدل
جاتا ہے اور اگر دل میں خبث اور بغض کا اندھیرا ہو تو زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے۔

حاضرینِ محترم! یہ ایک مسئلہ تھا اور اس کے بیان کی ایک اہمیت تھی اب موضوع طویل
ہے۔ اس پر اب ہم نے تطبیق کی گفتگو کو شروع نہیں کیا۔ آپ میری بات کو سمجھ گئے نا!
ابھی تک میں نے اس مسئلے کی صرف اہمیت بیان کی۔ اب اگر اس کو تمثیلات کے ساتھ
بیان کرنا شروع کرتے ہیں کہ یہ مختلف اقوال کیوں ہیں؟ اور ان کی تطبیق کیا ہے؟ اور تطبیق

کو سمجھانے کے لئے اس کی جو مختلف تمثیلات ہیں ان کا بیان کرنا اور پھر ان میں بڑی بڑی پیاری، بڑی بڑی اعلیٰ تمثیلات ہیں جن سے محبت سے پہلو علم کے اور فکر کے اور اعتقاد کے کھلتے جائیں گے۔ یہ ایک طویل مضمون ہے جو میں سمجھتا ہوں میں اگر مزید شروع کروں تو کم سے کم ایک یا ڈیڑھ گھنٹہ اور لگے گا۔ کم سے کم اُس مضمون کو پورا کرنے کے لیے۔ تو اگر آپ اجازت دیں تو میرا خیال ہے آج اب اس کے اتنے حصے کو اس بات کی اہمیت کو سمجھا کر کہ یہ جو مختلف اقوال کی بنا پر اسلام کا اور فقہی مذاہب کا اور دینی تعلیمات کا اور احادیثِ رسولؐ کا انکار کر دیا جاتا ہے یہ اندر کی خرابی ہے۔ یہ انکار نہیں بلکہ اس کے حُسن کا اضافہ ہوتا ہے۔ تو اتنی بات اگر آج سمجھ لی گئی تو اگر آپ اجازت دیں تو ہم اس پر اختتام کر لیں اور اس کا تھوڑا سا بیان اگلی بار کر کے تاکہ بات یاد تازہ ہو جائے اور پھر اس تفصیل کو آگے بیان کریں تاکہ تھکن بھی نہ ہو اور آپ اطمینان سے درس بھی سُن سکیں۔ کیا خیال ہے آپ کا؟ درست ہے۔ تو صرف اتنی بات ذہن نشین فرما لیں کہ تضاد قباحت کا باعث ہے اور اختلاف حُسن کا باعث ہے۔ تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اختلاف کو سراہا ہے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اختلاف کو سراہا ہے اور فرمایا ہے: اِخْتِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَۃٌ۔ میری امت میں اختلاف رحمت ہے۔ اختلاف سے کئی متبادل راہیں نکلتی ہیں۔ اور اختلاف نہ ہو تو فقط ایک راہ نکلتی ہے اور اگر ایک راہ ہی ہو اور متبادل راہیں نہ ہوں تو ممکن ہے کسی وقت کسی کو تمسک نہ کر سکے تو اس کے لئے صرف دو راستے ہوں گے یا اُس راہ پہ چلے یا اُس راہ سے ہٹ جائے اور اگر متبادل راہیں بھی ہوں تو کسی کو اگر یہ نہیں تو دوسری راہ پسند آ جائے یہ نہیں تو تیسری راہ زیادہ فائدہ دے جائے تاکہ راہِ حق سے ہٹنے کی بجائے بہتر ہے کہ بہت سی راہیں جا رہی ہیں ایک ہی منزل کی طرف تو ان میں سے کسی کو اپنا لیا جائے۔ اب میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں۔ آپ کو اس تصور کی مثال دیتا ہوں کہ جو کچھ آج بیان ہوا اس کا بعض دیگر مسائل کے سمجھنے میں آپ کو فائدہ پہنچے۔ ایک حدیث ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ پانی پاک ہے اور اُس کا مردار بھی پاک ہے۔ حدیث کیا ہے؟ پانی پاک ہے اور اُس کا میتہ جو ہے وہ مردار، وہ بھی پاک ہے۔ اس حدیث کی رو سے میں آپ کو ایک مثال دے رہا ہوں۔ اسی سلسلے کے ضمن میں اسی مسئلہ کی رو سے امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور ان کے فقہی مذہب پہ یہ طے پایا کہ مچھلی پانی کا جانور ہے اور وہ ذبح تو نہیں کرتے آپ؟ وہ مر بھی جائے تو آپ کے لئے حلال ہے کیونکہ پانی کا

جانور ہے اور اس کا مردار بھی پاک ہے اور مچھلی کے علاوہ پانی کا جانور حرام ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پانی کے جانور کو حلال قرار دیا اور باقی جانور پانی کے نہیں۔ اس پر امام شافعیؒ نے یا دیگر ائمہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اجمعین نے مچھلی کے علاوہ اور بھی بہت سے جانور جو پانی میں رہتے ہیں اُن کو اس حدیث کی رو سے حلال قرار دیا۔ اب اختلاف کس مسئلے پر ہوا۔ سمجھئے یہ۔ اختلاف حدیث پر نہیں ہے۔ اس مفہوم کو متعین کرنے پر ہے کہ پانی کا جانور کون سا ہے اور کون سا نہیں ہے؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تو فرما دیا کہ جو پانی کا جانور ہے، جو پانی کا مردار، مرنے والا ہے وہ حلال ہے اور اب اُس کے تعین پر اختلاف ہوا تو یہ مسئلہ تعبیر کا ہوا نا! یہ مسئلہ تعبیر اور تاویل کا ہوا، تشریح کا مسئلہ ہوا اس پر اختلاف ہوا Application of mind پر جب دماغ لگا اور سوچ بچار ہوا تو مفہوم متعین کیا جانے لگا کہ یہ جانور پانی کا قرار دیا جائے یا نہ قرار دیا جائے۔

سو امام شافعیؒ یا دیگر ائمہ جو اس طرف گئے جو باقی جانور بھی اسی ذیل میں ہیں انہوں نے یہ تعریف کی کہ جو جانور پانی میں رہتے ہیں وہ پانی کے جانور ہیں۔ مچھلی کی طرح جو جانور پانی میں رہ رہے ہیں، وہ کیا ہیں؟ پانی کے جانور ہیں سو وہ اگر مردار ہو گئے تو وہ بھی پانی کے ہو گئے لہٰذا حلال ہیں۔ اور اب یہ تعبیر اپنی جگہ وزنی اور درست ہے یا نہیں اپنی جگہ صحیح ہے نا! یہ ایک سوچ ہے مفہوم کے متعین کرنے میں اور پھر بعد میں بتاؤں گا کہ حضور علیہ السلام نے خود مفہوم کیوں نہ متعین فرمایا۔ یہ جو مفہوم ہم متعین کرتے ہیں کہ اختلاف ہو گئے آپ کے ذہن میں سوال اُٹھ سکتا ہے بھائی مضمون ہی حضورؐ متعین فرما دیتے جھگڑا ہی ختم ہو جاتا۔ یہ بعد میں سمجھ آ جائے گی میرے بتائے بغیر خود بخود سمجھ آ جائے گی تو انہوں نے مفہوم متعین کیا کہ پانی کا جانور وہ ہے جو پانی میں رہے۔ بات بڑی اچھی بڑی واضح ہے۔

اب آئیے امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طرف انہوں نے کہا کہ نہیں، پانی کا جانور وہ ہے جو پانی میں رہے بلکہ پانی کا جانور وہ ہے جو پانی کے بغیر رہ نہ سکے اور پانی کے باہر رہ نہ سکے۔ جو پانی کے باہر لے جایا جائے تو مر جائے۔ سو مچھلی پانی کے باہر جائے تو مر جاتی ہے۔ باقی جانور آپ دیکھتے ہیں پانی کے باہر بھی چلتے پھرتے ہیں۔ سو جب دو آراء سامنے آئیں تو لینے میں مدد ملتی ہے کہ وزن کس میں زیادہ ہے؟ اور اگر رائے ہی ایک سامنے ہو پھر انسان کے لئے دوسرا راستہ کوئی نہیں تو جب کمپئیر (Compare) کیا تو امام اعظمؒ کی رائے میں زیادہ وزن نظر آیا۔ اس میں زیادہ Reasoning ہے کہ جو پانی کے بغیر رہ نہ سکے اسی کو پانی کا جانور قرار دیا جائے۔ اس رائے میں زیادہ وزن ہے۔ سو اس کے نتیجے میں نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے مچھلی کے سوا باقیوں کو حلال نہ کیا اور انہوں نے (امام شافعیؒ) مچھلی کے علاوہ

بھی محبت سے جانوروں کو حلال کیا۔ اب یہ دونوں کا اجتہاد ہے اور مجتہد کا اجتہاد چونکہ نیک نیتی پر مبنی ہوتا ہے۔ اس لئے حق ہوتا ہے اور باعثِ ثواب ہوتا ہے۔ اگر مجتہد خاطی بھی ہو نتیجۃً خطا پر بھی پہنچے تب بھی اللہ ایک ثواب عطا کرتا ہے اور صحیح نتیجے پر پہنچے تو اللہ دو ثواب عطا کرتا ہے۔

صحیح بخاری میں ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: نیک نیتی سے مجتہد جب فیصلہ کرتا ہے تو اللہ بہر طور اَجر دیتا ہے اور جو لوگ نیک نیتی سے اس کے اجتہاد کی پیروی کرتے ہیں اللہ اُن کو بھی اَجر دیتا ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ مذاہب فقہی مختلف ائمہ کو ماننے والے جتنے ہیں سب حق پر ہیں۔ کسی ایک کو باطل نہیں کہتے کہ یہ سب ایک دوسرے کا احترام کرنے والے ہیں۔ اور ان لوگوں کی عظمت یہی تھی کہ وہ اختلاف علمی کے باوجود ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے اور مجھے کہنے دیجئے کہ ہماری ذلت اور رسوائی کا ایک سبب یہ ہے کہ جہاں اختلاف رائے ہو جاتا ہے وہاں دوسرے کو ذلیل کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں۔ اسے بدنام کرتے ہیں۔ وہ اختلاف گوارہ کرتے تھے۔ وہ عظیم تھے۔ ہم اختلاف گوارا نہیں کرتے۔ ہم گر گئے۔ علم کا زوال آگیا۔ علم زندہ رہتا ہے اختلاف کی بقا سے۔ علم تر و تازہ رہتا ہے اختلاف کی بقا سے۔ علم ارتقاء پزیر رہتا ہے اختلاف کی بقا سے اور علم ہمیشہ سفر کرتا رہتا ہے اختلاف کی بقا سے۔ مثبت تحقیقی اختلاف کا دروازہ آپ نے جب سے بند کرنا چاہا علم زوال آشنا ہوگیا۔

تو جب تعبیرات میں اختلاف ہوئے تو دو مذاہب وجود میں آئے۔ اب کچھ وہ ہیں جو مچھلی کے علاوہ بھی جانور کھاتے ہیں اور احناف مچھلی کے علاوہ جانور نہیں کھاتے۔ اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو بعد میں مفہوم متعین کیا جاتا رہا اور اختلاف ہوا۔ صاف ظاہر ہے۔ انسان سوچتا ہے کہ حضور علیہ السلام کے ذہن میں تو کوئی ایک ہی مفہوم ہوگا نا! یہ سوال ابھرتا ہے کہ جو صاحبِ قول ہیں۔ جو صاحبِ ارشاد ہیں، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذہن میں تو ایک ہی مفہوم ہوگا۔ یا وہ ہوگا، یا یہ ہوگا۔

لے

تو حضور علیہ السلام نے خود اپنا مفہوم کیوں نہیں بیان فرما دیا؟ اب اس کا جواب سمجھانا چاہتا ہوں کہ اگر اس کا مفہوم بھی بیان فرما دیتے تو راہ ایک ہی رہتی۔ متبادل راہیں نہ ہوتیں۔ اور ایک راہ کے مقابلے میں متبادل راہیں ہوں تو امت کے حق میں رحمت زیادہ ہے۔ اور فقط ایک راہ بتائی جائے دو کی بجائے تو رحمت کم ہے۔ کیوں؟ کہ اب ایسے لوگ بھی ہیں دنیا میں، ایسے علاقے، ممالک بھی ہیں کہ جو سارے کے سارے خشکی پر ہیں اور ایسے علاقے اور جزائر بھی ہیں جن کے ارد گرد سب سمندر ہیں۔ اور اللہ کی مخلوق اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اُمت ان جزیروں میں بھی بستی ہے اور خشکی کے علاقوں میں بھی بستی ہے۔ میں Reason بتا رہا ہوں۔ سبب کیوں؟ حکمت کیا ہے؟ آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مفہوم کو واضح نہ فرمانے میں۔ معلوم تھا کہ میری اُمت سمندروں میں گھر کر جزیروں میں بھی رہے گی کروڑوں کی تعداد میں اور میری اُمت خشکی پر بھی رہے گی۔ تو جو خشکی میں ہیں اُن کو مچھلی نہ ملے تب بھی کھانے کا بہت کچھ ہے۔ ہزار ہا جانور ہیں، ہزار چیزیں ہیں۔ مچھلی بھی ہو تب بھی بہت کچھ ہے اور سمندر کی مچھلی دریا کی مل جائے یہ بھی غنیمت ہے اور جو جزیروں میں ہیں ان کو کھانے کی اتنی کثرت کی چیزیں اور جانور میسر نہیں اُن کو جو کچھ ملتا ہے۔ پروویژن (Provision) سمندر سے آتی ہے اور اگر مچھلی کے علاوہ سب جانور ان کے لئے بھی حرام ہوتے جس طرح خشکی والوں کے لئے تو نتیجہ یہ ہوتا کہ ان کا جینا دوبھر ہو جاتا۔ سو دو راہوں کی گنجائش چھوڑی اور مشیتِ ایزدی نے کام یہ کیا کہ جو خشکیوں پر بسنے والے ہیں وہ زیادہ تر حنفی مذہب کے پیروکار ہیں اور جو جزیروں میں رہنے والے ہیں وہ شافعی مذہب کے پیروکار ہیں۔ اب جو شافعی ہیں جزیروں والے وہ بھی اپنے آقا کے ارشاد کا فیض پا رہے ہیں اور جو خشکی والے ہیں وہ بھی آقا کے ارشاد کا فیض پا رہے ہیں۔ اُن کے لئے وہ راہ کھول دی۔ اِن کے لئے یہ راہ کھول دی۔ یہ میں نے ایک مثال آپ کو عرض کی ہے اس تصور کے سمجھانے کے لئے کہ تعبیرات کے اختلاف میں کتنی رحمت ہے اور مفہوم کو واضح نہ کر دینے میں کتنی برکت ہوتی ہے بعض اوقات امت کے حق میں۔ آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حکمت والے نبی ہیں۔ "وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا"[۱] وہ حکمت والے نبیؐ ہیں۔ جہاں حکمت چاہتی تھی کہ بات کھولی جائے وہاں میرے آقاؐ نے بات کھول دی۔ جہاں حکمت کہتی تھی کہ بات چھپا کے کی جائے۔ وہاں آقاؐ نے چھپا

ـــــــ

[۱] پ ۳ سورۃ البقرۃ آیت ۲۶۹

کے لیے۔ یا کوئی خود تدبیر کریں اور ان کو یہ راہ مل سکے۔ دوسروں کو وہ راہ مل سکے اور وہ بھی کہہ سکیں کہ ہم دینِ حق پر ہیں۔ اختلافِ اقوال کی برکت اور رحمت کا تصور یہ ہے۔ بس یہ خلاف نہ بنے وہ دین کے خلاف نہ ہو جائے۔ اصول کے مخالف نہ ہو جائے اور ان کے باہمی احترام کا عالم یہ تھا کہ یہ امام شافعیؒ ان کی تحقیق میں رفع یدین تھا۔ امام اعظمؒ کی تحقیق میں رفع یدین کو ترک کرنا تھا لیکن امام شافعیؒ امام اعظمؒ کے پوتے شاگرد ہیں تو پوتے شاگرد ہو کر اپنے دادا استاد اور وہ بھی امام اعظمؒ جیسے استاد سے اختلاف کر رہے ہیں۔ اس اختلاف کو گستاخی نہیں سمجھتے تھے چونکہ یہ علمی دیانت پر مبنی اختلاف تھا لہٰذا گستاخی نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے کہ عظمت کے اعتراف کا عالم یہ تھا کہ باوجود اپنی تحقیق کے کبھی کبھی بغداد جاتے۔ شاگرد بھی ساتھ ہوتے تو سیدنا امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ کے مزار پر حاضری دیتے۔ جب وہاں جاتے تو نماز پڑھتے۔ تو رفع یدین ترک کر دیتے۔ بغیر رفع یدین کے نماز پڑھتے۔ شاگردوں نے پوچھا: حضرت! آپ کی تحقیق ہے۔ پھر یہاں آکر عمل کیوں نہیں کرتے؟ آپ نے فرمایا! کہ بیٹے! اتنے بڑے امام کی بارگاہ میں آکر اپنی تحقیق پہ عمل کرتے شرم آتی ہے۔ یعنی یہ عظمت علم ہے کہ اختلاف بھی ہے اور احترام بھی۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ، پوچھئے ان سے سیدنا امام جعفر الصادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور سیدنا امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسبت۔ امام اعظمؒ فرماتے ہیں۔ دو سال امام اعظمؒ نے مدینہ طیبہ جا کر امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہ میں زانوئے تلمذ طے کیا۔ دو سال خانوادہ رسولؐ اہلبیت پاک کی دریوزہ گری کی۔ اور ان سے پوچھا گیا کہ آپ کو امام اعظم کس شے نے بنایا۔ اس نے کہا کہ اللہ کی قسم اُن دو سالوں نے بنایا جو امام جعفر صادقؓ کے قدموں میں گزرے۔ [1] لَوْلَا السَّنَتَانِ لَهَلَكَ النُّعْمَانُ ؕ اگر وہ دو سال نصیب نہ ہوتے تو ابوحنیفہ ہلاک ہو جاتا۔ یہ احترام کا عالم ہے۔ وہ بھی امام تھے۔ یہ بھی امام تھے۔ لیکن اُن کا پلہ یہ کہ یہ اُن کے قدموں میں دو سال بیٹھنے کو اپنی نجات اور عظمتِ امامت کی بنیاد قرار دیتے ہیں اور اُن کا عالم یہ ہے کہ جب امام اعظمؒ ان کی خدمت میں ہوتے تو ان کا عالم اعتراف یہ کہ جب مسئلہ آتا تو فرماتے، ابوحنیفہؒ سے پوچھ لو۔ یہ ایک دوسرے کے احترام کی کیفیتیں تھیں۔ مسائل اور تحقیق میں

[1] سیرت النعمان

اختلاف ہوتا ہے۔ وہ اختلاف حسن کا باعث ہوتا ہے اور اختلاف کے باوجود احترام قائم رہتا ہے۔

سو آپ حضرات موجود ہیں۔ آپ کے لئے اس درس کی آخری گفتگو کا سبق یہ ہو اگر علم میں اصول کے باب میں ہمیشہ راسخ اور پختہ رہنا چاہیئے۔ اس میں گنجائش نہیں ہے لیکن تعبیرات میں تشریحات میں فروعات میں اختلافات کو گوارہ کرنا۔ دلائل کے ساتھ گوارہ کرنا۔ حوصلے کے ساتھ گوارہ کرنا اور اختلاف رائے کے باوجود ایک دوسرے کے لئے احترام کا قائم رکھنا یہ تقاضائے حسنِ خُلقِ محمدیؐ ہے۔ یہ تقاضائے حُسنِ خلقِ صحابہؓ ہے۔ یہ حُسنِ ائمہ ہے۔ یہ خُلق اکابر ہے۔ اسی سے اسلام کی رونقیں ہیں اور اسی سے اُمت کی برکتیں ہیں۔ اللہ رب العزت ہمارے حال پر رحم فرمائے۔

وما علینا الا البلاغ۔

مورخہ ۸ فروری ۱۹۸۷ء بروز اتوار
بمقام رحمت علی کمیونٹی سنٹر، اسلام آباد۔

قیمت ... : ۳ روپے

★ ملنے کا پتہ :

شعبہ نشر و اشاعت ادارہ منہاج القرآن ۲۷-بی فرخ پلازہ جی نائن المرکز (کراچی کمپنی) اسلام آباد۔

نظم

واللہ ہم ہر ایک یزیدی طاقت سے ٹکرائیں گے

انشاءاللہ سب طاغوتی بادل اب چھٹ جائیں گے
منہاج القرآن کے جھنڈے گلی گلی لہرائیں گے

بغض و انا کی کالی راتیں آخری پہر کو پہنچی ہیں
مہر و وفا کی سحر ہے گی بچھڑے سب مل جائیں گے

دینِ متین کا غلبہ ہوگا اُمت ایک ہو جائے گی
واللہ ہم ہر ایک یزیدی طاقت سے ٹکرائیں گے

نامِ نبیؐ کا صدقہ کھائیں غیر کے در پہ کیوں جائیں؟
الا اللہ کی ٹھوکر سے بت سارے توڑ گرائیں گے

طاہر نامی ایک انوکھا ہے گلشن میں پھول کھلا
ہم اس پھول سے خوشبو چُن کر نگر نگر مہکائیں گے

پتا پتا بوٹا بوٹا کیفِ سرور میں جھومے گا
ذکرِ نبیؐ کے ہم پروانے گھر گھر دیپ جلائیں گے

جس مہتاب کے دم سے بزمِ انجم میں تابانی ہے
ہم سب اس کی کرنیں بن کر دھرتی کو چمکائیں گے

احمد نواز انجم
صدر
اِدارہ منہاج القرآن اسلام آباد

۱۹۸۷ء

ایس ٹی پرنٹرز گوالمنڈی راولپنڈی